آخری تحفہ

منشی پریم چند

نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کُتب فتحپوری دھلی

آخری تحفہ

پریم چند

(جملہ حقوق بحق نرائن دت سہگل اینڈ سنز آف لاہور محفوظ ہیں)

پبلشرز

نرائن دت سہگل اینڈ سنز (لاہور)

چوک فتحپوری - دھلی
محلہ تھاپراں جالندھر شہر

پرنٹرز

نویں بار

قیمت ۱۲/

(محبوب المطابع برقی پریس دہلی)

فہرست

مقبولیت

پہلا ایڈیشن	۱۲۰۰	اپریل سنہ ۱۹۳۸ء
دوسرا ایڈیشن	۱۵۰۰	مارچ سنہ ۱۹۳۹ء
تیسرا ایڈیشن	۱۰۰۰	نومبر سنہ ۱۹۴۰ء
چوتھا ایڈیشن	۱۰۰۰	اپریل سنہ ۱۹۴۲ء
پانچواں ایڈیشن	۱۵۰۰	اگست سنہ ۱۹۴۳ء
چھٹا ایڈیشن	۲۰۰۰	جنوری سنہ ۱۹۴۴ء
ساتواں ایڈیشن	۱۰۰۰	فروری سنہ ۱۹۴۷ء
آٹھواں ایڈیشن	۲۰۰۰	نومبر سنہ ۱۹۴۹ء
نواں ایڈیشن	۳۰۰۰	جنوری سنہ ۱۹۵۱ء

عرضِ ناشر

پاکستان سے ہندوستان یعنی لاہور سے دہلی آئے ہم کو آج زائد از دو سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ اس عرصہ میں ہم کو اپنی تمام تر سرگرمیاں ترک کر کے چپ چاپ رہنا پڑا۔ جس کا ہمیں بہت افسوس ہے۔

اب جبکہ ہم نئی زندگی کے ناخوشگوار دور سے گذر چکے ہیں ــــ خون آلود لاشوں سے اٹی پگڈنڈی سے اس پار پہونچ چکے ہیں۔ میدان عمل میں ظاہر ہوتے ہوئے مسرت بے پایاں محسوس کر رہے ہیں۔

آپ سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ ہم تقریباً چوتھائی صدی سے آپ کی خدمت کر رہے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں ایک ہزار کے قریب سیاسی، معاشرتی، تمدنی، تاریخی، تفریحی، غرضکہ ہر قسم کے موضوع پر کتابیں پیش کیں۔ آپ نے ہمارے ہر نئے قدم پر

نے جوش سے حوصلہ افزائی فرمائی۔ روز روشن کی طرح یہ بات عیاں ہے کہ ہماری کامیابی کی وجوہ صرف ہماری محنت اور دیانتداری ہی نہ تھیں۔ اس میں آپ کی پُرخلوص سرپرستی اور حوصلہ افزائی کو بھی نمایاں دخل حاصل تھا۔

ہم لوگوں کو وہ سہولتیں میسر نہیں ہوسکیں۔ جو ہمارے چند ہم پیشہ دوستوں کو حاصل ہوئی ہیں۔ یہ دوست ہر دو ممالک یعنی ہندوستان اور پاکستان میں بے روک کاروبار کررہے ہیں۔ یہاں نہ بکنے والا مال وہاں چلا جاتا ہے۔ اور وہاں نہ بکنے والا یہاں کی مارکیٹ میں پھینکا جاتا ہے۔ غرض دونوں ملکوں کی وفاداری کا پورا فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔ مگر ہم اپنے وسیع ملک ہند کی عریض سرزمین پر مشکل سے پیر ہی رکھنے میں کامیاب ہوسکے ہیں۔ تن کر کھڑا ہونا چاہتے ہیں، تو لڑکھڑا جاتے ہیں۔ خیر ہم لوگ اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہونا جانتے ہیں۔ ہم کھڑے ہوں گے "ضرور ہوں گے" اور پوری شان کے ساتھ۔

۱۳ راگست ۱۹۴۷ء کو ہمارا مکان اور متعلقہ گودام جلا کر راکھ کردیا گیا۔ جس کی وجہ سے ہمیں ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کو مجبوری حالت میں لاہور کو خیرباد کہنا پڑا۔ لوہاری دروازہ کی دوکان اور ہسپتال روڈ کے دو گودام محفوظ رہے۔ مگر ہمارا اُن پر کوئی حق نہ تھا۔ دوکان تو دہلی کے ایک مشہور تاجر کتب کو پونے چھ سو کی گراں قدر رقم کے عوض الاٹ کردی گئی۔ گوداموں کا کیا ہوا۔ یہ آج تک معلوم نہیں ہوسکا۔

اگر ہم چاہتے تو ۳ رجون ۱۹۴۷ء اور ۱۱ راگست ۱۹۴۷ء کے درمیانی عرصہ میں جبکہ لاہور میں تقریباً امن تھا۔ ایک کوڑی کا نقصان اُٹھائے بغیر ہند آجاتے۔ مگر اس کا کیا کیا جائے، کہ ہم اپنی جنم بھومی کو نہ چھوڑ کر پاکستان میں ادب کی خدمت کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ خیال تھا، پاکستان بن جانے پر سیاسی

ٹکراؤ ختم ہو جائے گا۔ اور پھر سے امن و امان کا بول بالا ہو گا۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ اور مجبوری کی حالت میں ہم کو وہاں سے نکلنا پڑا۔

گو ہم لوگ فطرتاً گذرے ہوئے واقعات کو بھول جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں، کہ ہم ان دوستوں کے احسانات بھی بھول جانے کے عادی ہیں۔ جنہوں نے اس نازک وقت میں اپنی جانوں پر کھیل کر ہماری ہر ممکن امداد کی۔ ہم ان مسلمان دوستوں کے جنہوں نے پاکستان یا ہندوستان میں ہماری کسی طرح بھی امداد کی، بہت ممنون ہیں۔ اور ان کی عزت ہمیشہ ہمارے دلوں پر منقش رہے گی۔

یہاں آ کر ہمیں اپنے کاروبار کو از سر نو چلانے میں جن جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اور آئندہ واسطہ پڑنے کے امکان ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ آج کل کے زمانہ میں کاروبار کو کامیابی سے چلانے کے لئے کافی سرمایہ کی ضرورت ہے۔ اس کے بنا کوئی دھندا نہیں ہو سکتا۔ گرانی کی جو حالت ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ کاغذ گراں، چھپائی ناقص ہونے کے باوجود مہنگی۔ کتابت چار گنا اور جلد سازی کے نرخ چھ گنا زیادہ ہو چکے ہیں۔

آخر مجبوری حالت میں گورنمنٹ کے اعلانوں اور ملک کے لیڈروں کے بیانوں سے متاثر ہو کر جن میں انہوں نے یقین دلایا تھا، کہ مستحق کاروباری اداروں کو معقول رقوم قرضہ کی صورت میں دی جائیں گی۔ ہم نے محکمہ ری ہیبلی ٹیشن میں ایک درخواست برائے منظوری قرضہ دے دی۔

قریباً ایک سال کی مسلسل کوششوں کے بعد جو نتیجہ نکلا، وہ بے حد حوصلہ شکن تھا۔ ہماری درخواست رد کر دی گئی۔ کیوں؟ اس کا جواب دینے کا محکمہ والوں میں قاعدہ نہیں۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں، کہ آخر وجوہات بتانے میں محکمہ کا کیا نقصان ہے؟ ممکن ہے کسی غلط فہمی کی بنا پر ہی ہماری درخواست رد کی گئی ہو۔ اور وہ غلط فہمی

آسانی سے رفع ہو سکتی ہو۔

گورنمنٹ نے قرضے دئے، اور بعض حالتوں میں بڑی فراخدلی کا ثبوت دیا۔ مگر مستحق اور غیر مستحق کی پہچان کے لئے کون سا حربہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا ہمیں کچھ علم نہیں۔ کیونکہ جہاں بہت سے مستحق لوگوں کو مایوس ہونا پڑا۔ وہاں غیر مستحق لوگوں کو ان کی حیثیت سے بہت زیادہ قرضہ دیا گیا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیونکر ہو سکتا ہے؟ ہم آج تک اس راز کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔

محکمہ ری ہیبلی ٹیشن سے کورا جواب ملنے پر اب اپنے طور پر ہم نے تھوڑا بہت کام شروع کیا ہے۔ اور چند کتابیں شائع کی گئی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے۔

یقین کامل ہے، کہ اگر ایشور مہربان رہے۔ اور آپ نے حسب سابقہ ہماری حوصلہ افزائی فرمائی۔ تو ہم جلد ہی تمام تر مشکلات پر عبور حاصل کر لیں گے۔ اور آخر اس مقام پر پہنچ جائیں گے۔ جہاں سے ہمیں وقتی طور پر پیچھے ہٹنا پڑا تھا۔

سنہ ۱۹۴۹ء (ادارہ)

پریم چند

از جناب محمود نظامی صاحب بی۔ اے

اردو زبان کس قدر مظلوم ہے۔ کہ اس میں یا تو اچھا ادیب پیدا ہی نہیں ہوتا، یا پھر ہوتا ہے، تو وقت سے پہلے اُٹھ جاتا ہے۔ پہلے دو تین سالوں میں اُردو کے جو زبردست ارباب جلدی جلدی اُٹھ گئے۔ ان کی موت سے ہمارے ادب کو ایک المناک صدمے سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اس قحط الرجال کے زمانہ میں منشی پریم چند جیسے عالی مرتبہ ادیب کا اُٹھ جانا ہماری بہت بڑی ادبی بدبختی ہے۔ پریم چند کی موت سے گویا قصر اردو کا ایک بہت بڑا ستون گر گیا۔ یہ ایک ایسا وطنی حادثہ ہے۔ جس کی تلافی مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے۔

پریم چند کی ذات جامع کمالات تھی۔ اس کے قلم سے اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کو فیض پہنچتا رہا۔ چنانچہ اس وقت ٹھیک طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے اُٹھ جانے سے کون سی زبان کو زیادہ نقصان پہنچا ہے۔ اردو ناول نویسی کے اس فرسودہ میدان میں جہاں افراط و تفریط کی وجہ سے اچھّے اور بُرے انسانوں میں جوشے مابہ الامتیاز ہے۔ نظر نہیں آتی۔ اگر کسی شخص نے

اپنے لئے ایک نئی راہ نکالی، اور بھٹکتے ہوئے ادبا، کے سامنے ایک نیا نمونہ پیش کیا، تو وہ پریم چند ہے۔ یہ پریم چند ہی کا کمال ہے، کہ اس کی تصنیفات کے طفیل ہمارا جمود ایک اضطراب میں تبدیل ہو رہا ہے۔ اور اُردو ناول ایک زندہ اور چلتی پھرتی مخلوق نظر آنے لگا ہے۔

پریم چند نے اپنے قلم سے دیو و پری کے قصّے اور غیر فطری انسانوں کے افسانے سُنانے کی بجائے معاشرت کی خامکاریوں پر تنقید کی۔ ہماری معاشرت مغربی شائستگی کے مجہول اثرات کی وجہ سے اب تک عجیب کش مکش میں پڑی ہوئی ہے۔ معاشرت کے کس نمونے کو ہم اپنا نمائندہ سمجھ سکتے ہیں۔ یہ ایک بہت اہم سوال ہے۔ عوام قدامت پسند ہیں۔ تعلیم یافتہ متوسط طبقہ ابھی تک افراتفری کے عالم میں ہے۔ اعلیٰ طبقہ مغربی تہذیب کی مدح سرائی میں اپنی روایات کا سرے سے منحرف ہے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ ہمارے ناول کی عقبی زمین کس قدر کھوکھلی ہوگی۔ اس کے علاوہ ہمارا سیاسی تنزّل ہماری قومی زندگی کے ایک سے زیادہ پہلوؤں پر حاوی ہے۔ خود ہماری اقتصادی اور معاشی حالت بھی ہمارے سماج کی کئی کمزوریوں کو مضبوطی کے ساتھ پاؤں جمانے میں مددگار ہے۔ اس صورت میں آسانی کے ساتھ ایک صحیح نصب العین قائم کرنا یقیناً بہت مشکل ہے۔ اس کے علاوہ خود ہندوستانی زندگی ناول کی مقتضی نہیں۔ ہمارے ہاں رہنے سہنے کا طریقہ رسوم و تہوار، خاندانی خصوصیات، قومی روایات، نظریۂ زندگی، غرضیکہ کوئی چیز معیّن نہیں۔ خیالات کا رجحان، اور طبائع کا میلان حد درجہ مختلف ہے۔ اور سب سے مقدم یہ کہ ہم میں صنفوں کے ارتباط و اختلاط میں بھی آزادی نہیں۔ اس صورت میں ناول کو ترقی ہوتی تو کیونکر؟ دوسری طرف فرقہ وارانہ خیالات ہم پر اس قدر مسلّط ہیں، کہ کسی مسلمان یا ہندو مصنف کے لئے ممکن

نہیں، کہ آزادی سے تذکرہ کر سکے۔ اور خواہ وہ کتنی ہی فراخدلی سے غیر اقوام کے کرداروں کو پیش کرے۔ پھر بھی ممکن نہیں کہ اس پر تعصب کا الزام نہ لگے۔ مگر اسی ہمت شکن فضا میں رہ کر منشی پریم چند نے صحیح ناول نویسی کی داغ بیل ڈالی۔ اس کی لازوال شہرت کسی اخباری ہنگامہ خیزی یا پراپیگنڈے کی شرمندۂ احسان نہیں، وہ جو کچھ ہے۔ اپنی قابلیت اور عالمانہ استعداد کا نتیجہ ہے۔ اس نے اُردو کی ایک فرسودہ صنف کے توسط سے ایک ناقدر ماحول میں رہ کر بھی جو کچھ کیا۔ وہ ریاض اُردو کے ایسے سدا بہار پھول ہیں، جنہیں امتدادِ زمانہ کی بادِ خزاں کے جھونکے کُملا نہیں سکتے۔ یہ ایسے نقوش ہیں، جن کی آب و تاب گذرتے ہوئے وقت اور بدلتے ہوئے ماحول کے ساتھ ماند نہیں پڑ سکتی۔

پریم چند نے لفظی صناعیوں اور دلکشیوں پر توجہ دینے کی بجائے اور مفروضات اور بنے تخیلات کے مقابل میں جس طرح حقائق اور واقعاتِ زندگی کو موضوعِ تحریر بنایا۔ وہ اس کی انفرادیت کا ثبوت ہے۔ اس کی کتابیں نہ صرف ہمارے ناقص سماجی نظام کی مذمت کرتی ہیں۔ بلکہ قومیت اور وطنیت کے جذبے کی علمبردار بھی ہیں۔ پریم چند اپنے معاصرین کے برعکس اپنی کتابوں میں اپنے وطن کی وسیع دُنیا کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اسی کے مسائل حاضرہ پر غور و فکر کر کے اسی کی روزمرہ زندگی کی پیچیدگیوں کے حل کی بہترین صورتیں پیش کرتا ہے۔ اس نے جو کچھ لکھا ہے، وہ اپنے ملکی ماحول، معتقدات اور روایات کے درمیان رہ کر لکھا ہے۔ تاکہ ارباب حل و عقد سنجیدگی کے ساتھ اس کی تحریروں پر غور کر سکیں۔

پریم چند کا یہ فکر اپنے ملک سے عشق ہے۔ اور وہ اس کی روایات کا بہت بڑا محافظ ہے۔ اس لیے وہ ضرور ایک حد تک قدامت پسند نظر آتا ہے۔

مگر اس کی قدامت پسندی جہالت کی حد کو نہیں پہنچتی۔ وہ مغربی تہذیب کو شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بھی اس سے ہر وہ چیز قبول کرنے کے لئے تیار ہے۔ جس سے ہماری فطرت مسخ نہ ہو جائے۔ اور ہم اپنی اصلیت کو کھو نہ دیں۔

ہندوستان سے عشق رکھنے کی وجہ سے وہ کسانوں کا بھی سچا عاشق ہے۔ چنانچہ اپنی کتابوں کے اوراق میں پریم چند نے کسانوں، مزدوروں، دیہاتیوں اور ادنےٰ درجہ کے ملازموں کے جن مصائب کا نقشہ کھینچا ہے۔ وہ اس قدر سچا اور اس قدر صحیح ہے کہ وہ ہماری روزمرہ کی زندگی کا عکسی فوٹو دکھائی دیتا ہے اس کے تمام کردار ہندوستانی ماحول کے جیتے جاگتے انسان ہیں۔ جو آپ کے سامنے اسی طرح چلتے پھرتے ہیں۔ جس طرح آپ کو ہر روز اپنے شہر کی گلیوں، اور بازاروں میں ان سے سابقہ پڑتا ہے۔ اسی طرح پریم چند کے افسانوں کی مائیں، بہنیں اور بیویاں بالکل وہی ہیں۔ جن کے پاکیزہ جلووں سے ہندوستانی گھر معمور ہیں۔ اس میں شک نہیں، اس کے ناولوں میں بعض اوقات پلاٹ کی کمزوری پائی جاتی ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے ناول آٹھ نو سو صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور دو دو جلدیں تو کم و بیش ہر ایک کی ہیں۔ اسی طویل نویسی کی وجہ سے ان کے بعض حصوں میں پلاٹ کی وہ دل کشی مفقود ہو جاتی ہے۔ جو دوسرے مقامات میں نظر آتی ہے۔ مگر اس کے برعکس مختصر افسانوں میں یہ کمزوری سخت سے سخت نقاد کو بھی نظر نہیں آسکتی۔ ان کی کردار نویسی کا کمال بھی ان کی مختصر کہانیوں ہی میں نظر آتا ہے۔ یہاں انہوں نے ذرا ذرا سی بات سے عجب عجب نتائج مرتب کئے ہیں۔ اور اپنے قلم کو نفسیات کے لطیف ترین مطالعہ احساسات کا مظہر بنایا ہے۔

پریم چند کی تمام تصنیفات کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی بہت سی ایسی باتیں جنہیں ہم آسان اور ناقابل توجہ سمجھتے ہیں۔ فی الحقیقت پیچیدہ اور دقیق مسائل سے بھری ہوئی ہیں۔ لوگوں کے دلوں میں دنیا کی چیزیں بہت ہی کم کشش رکھتی ہیں۔ وہ دنیا کے ایک بہت بڑے حصّے کو دیکھنے سے محروم رہتے ہیں۔ اس لئے وہ اس دنیا میں رہ کر بھی اس دنیا سے الگ ہی رہتے ہیں۔ مگر بعض اس طرح کے خوش قسمت لوگ بھی ہیں، جن کی آنکھ اور دل، دماغ ہر جگہ بیدار رہتا ہے۔ فطرت کے گوشے گوشے سے انہیں پیغام ملتا ہے۔ دُنیا کی طرح طرح کی تحریکات ان کے دل کے ساز کو طرح طرح کے نغموں سے معمور کر دیتی ہیں۔

پریم چند اسی قسم کے انسانوں میں سے تھے۔ ان کی نگاہِ دوربیں ہر چیز پر پڑتی تھی۔ اور اپنی ضرورت کی چیزیں اس میں سے چُن لیتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی کہانیوں میں ہماری معاشرتی زندگی کی ایک ایسی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ جسے ہم کئی مغربی مصنفین کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں۔

پریم چند کے ہاں ہماری معاشرت کی بلندی اور پستی دونوں نظر آتی ہیں ان کے ہاں اُمراء اور رُؤسا کا تذکرہ ہی نہیں۔ بلکہ راہ گیروں، سرائے والوں، کسانوں، مزدوروں، دیہاتیوں، چھوٹے چھوٹے شہروں میں رہنے والوں غرض ہندوستان کے ہر قسم کے حقیر لوگوں کا حال بھی موجود ہے۔ بلکہ انہوں نے التزاماً کوشش کی ہے۔ کہ ان کے ہر ناول کا پس منظر دیہات ہو۔ اور سچ پوچھئے، تو دیہات کی صحیح سپرٹ کو سمجھنے والا اُن سے بہتر نہیں مل سکتا۔ اسی دیہاتی فضا کی وجہ سے پریم چند ہندو مسلم اتحاد کے بھی بہت بڑے علمبردار ہیں۔ تعصّب اور فرقہ واری کی جو فضا آج ہندوستان میں پھیلی

ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کا پرتو دیہات میں نہیں پہنچا۔ اس پُرسکون فضا میں ہندو مسلم سوال پیدا نہیں ہوا کرتے۔ وہاں ہندو اور مسلمان پوری صلح، اور آشتی سے زندگی کے دن بسر کرتے ہیں۔ اور ان کی تمام روایات باہمی محبت اور رواداری کی آئینہ دار ہیں۔ اسی امن پسندی اور برادرانہ برتاؤ کا نقشہ آپ کو پریم چند کے افسانوں میں جگہ جگہ پر بکھرا ہوا ملے گا۔ جہاں ہندو مسلمان دیہاتی، کج نہاد، سرمایہ دار یا ظالم زمیندار کے مقابلے میں دو علیحدہ علیحدہ قومیں نہیں۔ بلکہ ایک ہی برادری کے افراد ہیں۔ شہروں میں آئے دن جو فرقہ وار سانحات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی جو گھناؤنی تصویر "پردۂ مجاز" میں ملتی ہے۔ وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ یقیناً کوئی شخص اُسے اس سے بہتر پیرائے میں بیان کر کے اس سے عمدہ نتائج مرتب نہ کر سکتا تھا۔ پریم چند نے جو کچھ لکھا ہے۔ ان کی مختصر ترین کہانی سے لے کر ان کے طویل ترین ناول تک سب میں واقعات کا ایک ایسا سلسلہ ملتا ہے۔ جس سے آخر تک میں کچھ خاص طرح کے نتائج مُرتب ہوتے ہیں۔ یہ ایسے افسانے نہیں، جن کی عشق سے ابتدا ہوتی ہے۔ ہجر ان نصیبی پر سارے قصے کی بنا، اور وصل پر ناول کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور ناول نویس اس اخلاقی تعلیم کا، جس کے لیے، یہ سب کچھ لکھا گیا ہے۔ کہیں بھی ذکر نہیں کرتا۔ اور ناول پڑھنے کے بعد آپ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ناولسٹ نے آپ کو کوئی خاص فلسفہ یا کوئی مخصوص نظریہ سمجھا دیا ہے۔ مگر پریم چند نے جو کچھ لکھا ہے۔ وہ ایک خاص غرض اور ایک مخصوص غایت کی بنا پر ہے۔ "بازارِ حُسن" میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے مصنف، قارئین کے سامنے سماج کا ایک نہایت تاریک رُخ پیش کرتا ہے۔ اور ملک کی عصمت فروشی کے اڈوں کی لعنت کے استیصال کے لیے

قلم اُٹھاتا ہے۔ "گوشۂ عافیت" میں آقا اور غلام، کسان اور زمیندار ہیں جو غیر فطری امتیاز ہے۔ اس مکروہ واقعہ کی تذلیل کرتا ہے۔ "چوگان ہستی" میں وہ بتلاتا ہے، کہ دیہات کے تباہ ہونے سے مجلسی زندگی کی تباہی اور بے راہ روی کا ابر کس طرح محیط ہوتا ہے۔ اور سرمایہ دار کے گھناؤنے مقاصد کے سامنے انسانیت کس طرح بے دست و پا ثابت ہوتی ہے۔ "میدانِ عمل" میں وہ ثابت کرتا ہے کہ صبر و استقلال کے سامنے استبداد اور جبر کو بالآخر کس طرح شکست ہوتی ہے۔ غرضکہ پریم چند شروع سے آخر تک ایک ایک واقعہ دُہراتا ہے۔ جو چُپکے چُپکے آپ کے دل اور دماغ پر اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر میں وہ آپ کو اپنا ہمنوا بنا لیتا ہے۔ اور آپکے پاس اختلاف رائے کا موقعہ نہیں چھوڑتا۔

پریم چند کی عالمگیر کامیابی کا راز اس کی سیرت نگاری ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے، جہاں عام مصنفین ہمیشہ ناکام رہ جاتے ہیں۔ اس لئے، کہ وہ حقیقت سے بے خبر ہوتے ہیں۔ کہ کسی شخصیت پر ماحول کا کیا اثر ہوتا ہے روزمرّہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات کیونکر خیالات کو بدل دیتے یا ان میں استواری پیدا کرتے ہیں۔ آپس کا نزاع، ملک و قوم کی تمدنی و معاشرتی حالت، مذہبیت کا جوش اور اقتصادی کیفیت سے سیرت کے نمونے کس طرح نظر انداز ہوتے ہیں۔ نیک چلن سے بدمعاش، رندمنش سے فرشتہ سیرت، جنگجو سے صلح پسند، اور وطن پرست سے ملک فروش ہونا، سب کچھ انسان کے لئے ممکن ہے۔ لیکن واقعات و ماحول، تربیت و تعلیم، سوسائٹی اور معاشرت کی تبدیلیاں ان کا باعث ہوتی ہیں۔ کردار نگاری میں ان کا اظہار، ان کا درجہ بدرجہ اثر دکھانا ضروری ہے۔ پھر ہر انسان

دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ ہر ایک کی طینت جُدا۔ طبیعت علیحدہ، مزاج الگ، ان تمام امور کا خیال لازمی اور ضروری ہے۔ ایک ہی طرح کے واقعات دو مختلف شخصیتوں کو پیش آئیں۔ تو یقیناً ان کے نتائج، ان کے افعال و کردار، ان کے خیالات بھی جداگانہ ہوں گے۔ لیکن ہمارے اردو ناولوں میں کردار ایک ہی قطع، ایک ہی نمونے، اور ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں۔ اور افسانے کے تمام افراد کا کیرکٹر حتمی ہوتا ہے۔ یا تو وہ فرشتہ ہے یا شیطان، مگر پریم چند کا کُلیہ ہے کہ انسانی فطرت نہ بالکل سیاہ ہوتی ہے۔ نہ بالکل سفید، اس میں دونوں رنگوں کا ایک عجیب اتصال و امتزاج ہوتا ہے۔ انسان حالات موجودہ کا محض ایک کھلونا ہے۔ جو اس کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے" چوگانِ ہستی" میں سے راجہ مہندر کمار اور "گوشۂ عافیت" میں سے مایا شنکر کی مثالوں کو لیجیے۔ غالباً پہلی نظر میں آپ ان دونوں کو نہایت اچھا آدمی سمجھتے ہیں مگر جوں جوں افسانہ بڑھتا ہے، اور حالات بدلتے جاتے ہیں، ان کی سیرتیں منقلب ہوتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ ان کا اولیں اور آخری رنگ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پریم چند کے تمام کردار مکمل ہیں۔ اس کے افسانے کا ہر فرد اسی مادی دنیا کا باشندہ ہے۔ جنت کا فرشتہ یا دوزخ کا شیطان نہیں۔ ہر کردار میں چند خوبیاں بھی ہیں۔ اور کمزوریاں بھی۔ کسی میں خوبیاں زیادہ ہیں، کسی میں خامیاں۔ مگر وہ نری خوبی، یا محض بدی ہی کا مجموعہ نہیں۔ پریم چند کے متعلق یہ چیز یقیناً باعثِ حیرت ہے کہ انہوں نے اخلاق انسانی کی صحت سے زیادہ اس کی بیماریوں کی طرف توجہ کی ہے۔ اور ان کی نگاہ کا رُجحان انسانی پستی کی طرف ہے۔ یعنی انہیں پڑھ کر ہم اس پستی سے زیادہ واقف ہو جاتے ہیں۔ جس میں نادانی اور قسمت کی

خرابی انسان کو گرفتار کر سکتی ہے۔ بہ نسبت اس بلندی کے جس پر اس کی فطرت کی پوشیدہ قوتیں اُسے پہنچا سکتی ہیں۔ مگر پریم چند جن مفلس مصیبت زدہ اور بدچلن انسانوں کا ہم سے تعارف کراتے ہیں۔ ان کی فطرت افلاس اور اس کی ملزومہ کمزوریوں کی زنجیروں میں اس بُری طرح جکڑی ہوئی ہے کہ ان کے ماحول میں راہ راست پر چلنے کی ترغیب دلانے والے اثرات کام نہیں کرتے لیکن انسانیت کی اس عبرت انگیز بربادی میں بھی ایک روشنی کبھی کبھی نظر آجاتی ہے۔ جس پر اگر ہم اپنی نظر قائم رکھ سکیں، تو پریم چند کے تمام ویرانے آباد معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اس کی بیماریوں میں صحت کے وہ تمام آثار، اور مُردوں میں زندگی کی وہ تمام علامات ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ جو ہم کو یقین دلا دیتی ہیں۔ کہ انسانیت کا شعلہ کمزور پڑ سکتا ہے۔ مگر اس کی چنگاری کبھی بجھ نہیں سکتی۔ پریم چند نے انسانیت کا جو جوہر دریافت کیا ہے، وہ ہمدردی ہے۔ اور اس کی مدد سے وہ زندگی کی تاریکی کو روشنی میں تبدیل کر کے دکھا دیتا ہے۔

پریم چند انسان کی فطرت کے متعلق بہت بلند رائے رکھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے، کہ فطری بلندی انسان سے بہ آسانی زائل نہیں ہوتی۔ اس کی سیرت منقلب ہونے پر بھی اپنی صلاحیت نہیں کھوتی۔ پریم چند کے ناول اپنے نتائج کے لحاظ سے عبرت کی تصویر نہیں۔ جو ہمارے سامنے دوسروں کی حماقتیں ایک غیبی تنبیہہ کی شکل میں پیش کرتی ہے۔ بلکہ اس عبرت کا مرقع ہیں۔ جو ہمارے دلوں کو انسانی ہمدردی کی جولانگاہ محبت اور ایثار کا سرچشمہ بننے کا حوصلہ دلاتی ہے۔ جس سے فطرت میں وسعت، دل میں درد، اخلاق میں محبت، اور ہمدردی پیدا ہو۔ گو پریم چند کے کئی اصول پہلی نظر میں مبالغہ آمیز جہاں فراموشی

کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ہم زیادہ غور کریں، تو ہمیں یقین ہو جائے گا، کہ یہ کوئی دیدہ و دانستہ خیال آرائی نہیں۔ نہ ایسی جدّت پسندی جو حد سے اس قدر تجاوز کر گئی ہے، کہ مہمل یا ناگوار ہو جائے۔ مثلاً پریم چند کا نظریہ ہے کہ اپنے تعلیمی اور افادی اثرات کی وجہ سے انسان کے لئے غصہ اور حسد، کذب و دغا، جعل و فریب بھی ضروری ہیں۔ وہ ضبطِ نفس کا قائل نہیں، ضبط اور احتیاط خلقی نشو و نما میں مانع ہیں۔ وہی پودا تناور درخت ہو سکتا ہے۔ جو صبا اور سموم، مینہ اور اولے، خشکی اور تری میں یکساں کھڑا رہے۔ اس کے لئے سموم اتنی ہی ضروری ہے جتنی صبا، خشکی اتنی ہی حیات پرور جتنی تری۔ اسی طرح تکمیل نفس کے لئے بھی نیرنگیٔ تجربات لازمی ہیں۔ یہاں تک کہ کذب و دغا میں بیش بہا تعلیمی اثرات پوشیدہ ہیں۔ چنانچہ تجربات سے سیرت کے مختلف پہلوؤں کی ترتیب و تکمیل ہوتی ہے۔ درحقیقت پریم چند کو اپنے تجربے کے دوران میں جو ناگوار باتیں دریافت ہوئی ہیں۔ ان کے اعلان کرنے میں اس نے مطلقاً تکلف نہیں کیا۔ اور اس نے اس خیال پر بھی وقت ضائع نہیں کیا کہ دنیا کیا کہے گی۔ یا کیا سمجھے گی۔ مثلاً غریبی امیری کے غیر فطری امتیاز کا بہت بڑا دشمن ہونے کے باوجود، اور افلاس کو مارِ سیاہ سمجھتے ہوئے بھی پریم چند اسے تکمیل نفس کے لئے تمدن سے کہیں زیادہ ضروری سمجھتا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک یہ انسان میں مضبوط ارادہ، عزم کامل، ہمدردی اور دل سوزی پیدا کرتا ہے۔ سچ پوچھئے تو ایسی ہی ناگوار باتوں کو معلوم کر کے ہم اپنی فطرت کی اندرونی کیفیات کو بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ اور کیرکٹر، اخلاق، اور اعمال کے پیچیدہ معمے آسانی سے حل کر سکتے ہیں۔

پریم چند کے تجربات نہایت تلخ ہیں۔ اس کا فلسفۂ زندگی اور فلسفۂ کائنات

نہ صرف بہت معین اور بہت با اثر ہے۔ بلکہ بہت نرالا بھی۔ مثلاً اس کا تجربہ ہے کہ اس کارزار ہستی میں مذہب اور اخلاق ہی پر ہر چیز کا انحصار نہیں۔ یہاں مکر و فریب اور دغا بھی جائز ہیں۔ بشرطیکہ ان سے مطلب پورا ہوتا ہو۔ یہاں کام کے جا و بے جا ہونے کا فیصلہ کامیابی کے اعتبار سے کیا جاتا ہے۔ اگر جیت گئے، تو سارے دھوکے اور مغالطے مساعدت کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ ہمارے کام کی تعریف ہوتی ہے۔ اور اگر ہار گئے، تو انہیں گناہ کہا جاتا ہے غرضکہ انہی تجربات کی روشنی میں اپنے افسانے کے کردار آپ کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور آپ ان میں زندگی کے متحرک آثار کا جلوہ دیکھتے ہیں۔

در اصل پریم چند نے یہ تمام کتابیں ہندوستانی کسانوں کے دُکھ درد سے ہی بے قرار ہو کر ان کے غموں، تمناؤں، اور ان کی امیدوں کی داستان کے طور پر لکھی ہیں۔ "گوشۂ عافیت" میں حسن و عشق کی ایک نہایت دل پذیر داستان ہے۔ جو گاؤں کے رئیس اور اس کی سالی سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں افعال و واقعات کو سمجھانے کے لیے اُن کے اسباب و علل سے جس طرح بحث کی ہے۔ وہ پریم چند کے علم النفس کے ماہر ہونے کا ثبوت ہے۔ لیکن پریم چند کا کمال یہاں نہیں، اس کے فن کی تکمیل وہاں ہوتی ہے۔ جہاں وہ اسی کہانی میں سکھو، بلراج، گھرن، بھگتا، منوہر، قادر میاں، غوث خاں کو دکھاتا ہے۔ ربیع کی فصل، بیگار کے جھگڑوں، اور عدالتی کارروائیوں کا دل سوز قصہ بیان کرتا ہے۔ کیونکہ پریم چند کی طبیعت کا جوہر دیہات کے تذکرے ہی میں کھلتا ہے۔ "گوشۂ عافیت" کے حاجی پور میں چلے جائیے یا "چوگان ہستی" کے پانڈے پور میں۔ آپ کو وہاں کی سادہ اور پاکیزہ جھونپڑیوں کی بے سروسامانی میں ایک روحانی

اطمینان اور ایک سرمدی سکون میسّر آجائے گا۔ یہاں کے مظلوم اور بیکس رہنے والوں کے معصوم چہروں پر ان کے مصائب کے مقابل میں مسرت کا ایک روح پرور تبسم کھیلتا ہوا دکھائی دے گا۔ یہی پریم چند کے ارمانوں کی دنیا ہے۔ جسے وہ کارخانوں اور ملوں کے مہلک دھوئیں میں مستور ہونے نہیں دے سکتا۔ اور جس کا تحفظ وہ انسانیت اور انسانی اخوت کے لئے ضروری سمجھتا ہے۔

پریم چند کی نظروں میں کسان اور مزدور بہت عزت کے مالک ہیں۔ چنانچہ اس کے نزدیک ہمیں غریبوں کے اس طبقہ کو قابل نفرت سمجھنے کا کوئی حق نہیں۔ ہم جو شب و روز رشوتیں لیتے ہیں۔ سود کھاتے ہیں۔ غریبوں کا خون چوستے ہیں بے کسوں کا گلا کاٹتے ہیں۔ ہرگز اس قابل نہیں کہ جمہور کے کسی حصّے کو حقیر سمجھیں۔ سب سے ذلیل تو ہم ہیں۔ سب سے بڑے گنہگار اور بدکار خود ہم ہیں۔ جو اپنے تئیں مہذب، ممتاز، منوّر، اور مرفع سمجھتے ہیں۔ مگر کسی کے کام نہیں آسکتے۔ اسی طرح ہم میں سے کسی ایک دوسرے کو غلام کہنے کا بھی حق نہیں۔ اندھوں کی بستی میں کون کسی کو اندھا کہے گا؟ ہم سب کے سب امیر ہوں، یا غریب، راجہ ہوں یا فقیر، غلام ہیں۔ ہم اگر جاہل، مفلس گنوار ہیں، تو کم درجے کے غلام ہیں۔ ہم اپنے رام کا نام لیتے ہیں۔ اپنی گائے پوجتے ہیں۔ اپنی گنگا میں اشنان کرتے ہیں، اپنی بولی بولتے ہیں۔ اپنی دھوتی باندھتے ہیں۔ اور اگر ہم تعلیم یافتہ صاحب ثروت اور بیدار ہیں، تو بہت بڑے غلام ہیں۔ پتلون پہنتے ہیں۔ بدیسی زبان بولتے ہیں۔ کُتّے پالتے ہیں۔ ٹب میں نہاتے ہیں۔ اور اپنے بھائیوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ غلامی

صرف روح سے تعلق رکھتی ہے۔ موٹر، بنگلے، پولو اور پیانو، یہ سب لوہے کی بیڑیاں ہیں۔ جنہوں نے ان کو نہیں پہنا، وہی سچی آزادی کا لطف حاصل کر رہے ہیں۔ جو اپنے قومی لباس اور قومی معاشرت کے لئے کسی دوسرے کے محتاج نہیں، ہم جو مہذب اور روشن خیال بنتے ہیں۔ لوہے کی بیڑیاں پہن کر اپنی روحانی آزادی کو ہاتھ سے کھو کر کسانوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ انہیں قابلِ رحم خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ ہم خود قابلِ رحم ہیں۔ جو صاحب بہادر کے بنگلوں پر جبیں سائی کرتے ہیں۔ خانساموں کے ناز اُٹھاتے ہیں۔ پھولوں کی ڈالیاں لئے دربدر گھومتے ہیں۔ کیا کسانوں کو بھی کسی نے یہ بیہودہ حرکتیں کرتے دیکھا ہے؟

پریم چند کے کارناموں میں سب سے نمایاں شے اس کی سیرت نگاری کے علاوہ اس کا اچھوتا اندازِ بیان ہے۔ جس سے پڑھنے والے کے سامنے بالکل تصویر سی کھینچ جاتی ہے۔ دلکش انداز بیان سے پریم چند نے اپنے مفہوم کو واضح کرنے میں بہت مدد لی ہے۔ اس سلسلے میں پریم چند کی خوبی یہ بھی ہے، کہ اس نے جس طبقے کے افراد کو پیش کیا ہے۔ ان ہی کی زبان میں ان کا مکالمہ ادا کر دیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس خوبی کی بدولت اس کی تصنیفات میں اپنی جدت، زورِ بیان، سادگی، طبقہ کی زبان پر جو پورا قابو حاصل ہے، وہ تو خیر ہے ہی۔ لیکن اس کے علاوہ جو زبان دیہاتیوں کی استعمال کرتے ہیں۔ وہ بہت سادہ اور برمحل ہوتی ہے۔ اور اپنی صفائی کی وجہ سے ہیرے اور جواہر کی طرح ان کی تصنیفات میں جڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ بعض معترضین کو پریم چند کی سلیس، سادہ

عام فہم زبان پر اس لحاظ سے اعتراض ہے کہ انہوں نے دیہاتی محاوروں اور الفاظ از قسم "دھونس" و "تبیل" وغیرہ کو بطور تحریک زبان میں شامل کر لیا ہے۔ لیکن بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا جائے۔ تو ظاہر ہوگا، کہ یہ خامی درحقیقت خوبی ہے۔ افسانہ نگاری کے لیے سلیس اور عام فہم زبان ہی بہترین ہو سکتی ہے۔ پریم چند کی بے پناہ قوتِ تخلیق کا راز اسی سلیس اور عام فہم زبان میں پنہاں ہے۔ یوں بھی وہ اردو کیا، کہ جب تک قاموس و لغات داہنے بائیں تشریف فرما نہ ہوں۔ تحریر کا معنی مدعا سمجھ ہی میں نہ آسکے۔ دھونس یا اسی قسم کے دیگر الفاظ کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیے، کہ ہر لفظ ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس کی خوبی یا برائی کا انحصار استعمال کرنے والے کے ذوق پر ہے۔ لفظ بذاتِ خود نہ بھلا ہے نہ برا۔ ایک اچھے سے اچھے لفظ کا بے محل استعمال اسے ناگوار اور برا بنا دیتا ہے۔ ایک معمولی اور عامیانہ لفظ کا صحیح اور باموقع استعمال عبارت میں خاص شان پیدا کر دیتا ہے۔ عامیانہ بول چال کو حقارت سے دیکھنا عالمانہ خود پسندی کی علامت ہے۔ یہی عام بول چال زبان کا سرچشمہ اور قوت ہے۔ جس سے وہ ہر وقت غذا اور تقویت حاصل کرتی رہتی ہے۔ زبان کو عام انسانی معاشرت اور حالات سے دوش بدوش رہنا ضروری ہے۔ ایسی صورت میں لازم ہے کہ وہ عوام کی بول چال سے فیض حاصل کرتی رہے۔ میں تو سمجھتا ہوں، پریم چند کا بہت بڑا احسان اردو پر یہ ہے کہ انہوں نے ہمارے نچلے طبقے کے ایسے الفاظ اور محاورات جو صرف بول چال میں زبانوں پر تھے۔ ادبی زبان میں داخل کر دئے۔ ان سے زبان کی رونق دوبالا ہو گئی۔ اور یہ کوشش بہت ہی قابلِ تحسین تھی۔ اس اعتراض سے قطع نظر معنوی طور پر، پریم چند کی کتابیں ایک خاص درسِ حیات، ایک ٹھوس

لائحہ عمل، آپ کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ پریم چند ہماری روزمرہ کی زندگی کے واقعات کی ایک ایسی تصویر پیش کرتا ہے۔ جس میں وہ اپنے فن کی بوقلمونی سے افسانوی ماحول اور کرداروں کے تمام اسقام داوصاف نقش کرنے کے بعد ایک نصب العین وضع کر دیتا ہے۔ مگر وہ آپ کو ہماری سوسائٹی کے نقائص اور ہمارے سماجی نظام کی کمزوریوں کو دکھا کر مایوسی کی ظلمت آفریں آبادی میں بھٹکنے کے لئے نہیں چھوڑتا۔ بلکہ وہ ان کے نقائص کے ساتھ ان کی اصلاح کی عملی تشکیل بھی بتلاتا ہے۔

غرضکہ پریم چند ہماری زبان اور ادب ہی کا محسن نہیں، بلکہ اس کے احسانات ہمارے ملک کے لاتعداد افراد اور اشخاص پر بھی ہیں۔ جن کی ترجمانی کے لئے اس نے اپنے بے پناہ قلم کو جنبش دی۔ اور جن کی حمایت میں وہ زندگی بھر مخالف عناصر سے مردانہ وار جنگ کرتا رہا۔ بابو راجندر پرشاد نے پریم چند کے اندوہناک سانحۂ ارتحال پر کیا خوب فرمایا ہے:-

"جب میں ان کی تصانیف کا خیال کرتا ہوں، تو مجھے ان میں انسانی زندگی کے دردناک غموں کی جیتی جاگتی تصویر ملتی ہے۔ ان کی تصانیف پڑھنے والا اوپر ہی اُٹھتا ہے نیچے نہیں گرتا۔ پریم چند جی ان مصنفین میں سے نہیں تھے، جو دوسروں کے کپڑے پہن کر اپنی شان بڑھاتے یا دوسروں سے اُدھار مانگ کر اپنا رُعب دکھاتے ہیں۔ پریم چند کی شان ان کی اپنی شان ہے۔ انہوں نے جو کچھ لکھا، ان کا اپنا طبع زاد ہے۔ اتنی شان والے پریم چند جی ایسے بلند معیار ادیب اور اس قدر سچے انسان تھے۔ پھر بھی جیتے جی ان کی قدر نہ ہوئی۔ کیا یہ آنسو بہانے کی بات نہیں؟

"مجھے ان کی تصنیفات میں درد کی تصاویر ملتی ہیں۔ اپنے قلم کی نوک سے وہ ہمیشہ کاغذ پر درد کی تصویریں اس طرح نقش کر دیتے ہیں، کہ ان کے ساتھ ان کے قارئین کو رونا پڑتا ہے۔ یہی ان کی خصوصیت تھی۔ مگر خود ان کی زندگی کچھ کم رُلانے والی اور کم دردناک نہیں۔"

محمود نظامی

قاتل

جاڑوں کی رات تھی - دس نبجے ہی سڑکیں بند ہو گئی تھیں - اور گلیوں میں سناٹا تھا - بوڑھی بیوہ ماں نے اپنے نوجوان بیٹے دھرم ویر کے سامنے تھالی پروستے ہوئے کہا ۔" تم رات تک کہاں رہتے ہو بیٹا ؟ رکھے رکھے کھانا ٹھنڈا ہو جاتا ہے ۔ چاروں طرف سوتا پڑ گیا - آگ بھی تو اتنی نہیں رہتی ، کہ اتنی رات تک بیٹھی تاپتی رہوں "

دھرم ویر شکیل و توانا نوجوان تھا - تھالی کھینچتا ہوا بولا ۔" ابھی تو دس بھی نہیں نبجے اماں ! یہاں کے مُردہ دل آدمی سرِ شام ہی سو جائیں تو کوئی کیا کرے - یورپ میں لوگ بارہ ایک نبجے تک سیر و تفریح کرتے رہتے ہیں - زندگی کے لطف اُٹھانا کوئی ان سے سیکھ لے - ایک نبجے سے پہلے تو کوئی سوتا ہی نہیں "

ماں نے پوچھا ۔" تو آٹھ دس نبجے سو کر اُٹھتے بھی ہوں گے "

دھرم ویر نے پہلو بچا کر کہا ۔" نہیں اُٹھتے - وہ چھ نبجے ہی اُٹھ بیٹھتے

ہیں۔ ہم لوگ بہت سونے کے عادی ہیں۔ دس سے چھ بجے تک آٹھ گھنٹے ہوتے ہیں۔ چوبیس گھنٹوں میں آٹھ گھنٹے آدمی سوئے، تو کام کیا کرے گا؟ یہ بالکل غلط ہے کہ آدمی کو آٹھ گھنٹے سونا چاہیئے۔ انسان جتنا کم سوئے۔ اتنا ہی اچھا۔ ہماری سبھا نے اپنے دستورالعمل میں داخل کر لیا ہے کہ اس کے ممبروں کو تین گھنٹے سے زیادہ نہ سونا چاہیئے۔"

ماں اس سبھا کا ذکر سنتے سنتے تنگ آ گئی تھی۔ یہ نہ کھاؤ۔ وہ نہ کھاؤ۔ یہ نہ پہنو۔ وہ نہ پہنو۔ نہ بیاہ کرو نہ شادی کرو۔ نہ نوکری کرو، نہ چاکری کرو۔ یہ سبھا کیا آدمیوں کو سنیاسی بنا کر چھوڑے گی۔ اتنا تیاگ تو سنیاسی ہی کر سکتا ہے۔ تیاگی سنیاسی بھی تو نہیں ملتے۔ ان میں بھی زیادہ تر نفس کے بندے، نام کے تیاگی ہیں۔ آج سونے کی قید بھی لگا دی۔ ابھی تین مہینے کی سیاحت ختم ہوئی ہے۔ جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرتے ہیں۔ اب بارہ بجے کھایئے۔ یا کون جانے رات کو کھانا ہی اڑا دیں۔ اعتراض کے لہجہ میں بولی۔" جب ہی یہ صورت نکل آئی ہے کہ چاہو تو ایک ایک ہڈی گن لو۔ آخر سبھا والے کوئی کام بھی کرتے ہیں۔ یا محض آدمیوں پر قیدیں ہی لگایا کرتے ہیں؟"

دھرم ویر بولا:۔" جو کام تم کرتی ہو، وہی ہم کرتے ہیں۔ تمہارا مقصد بھی قوم کی خدمت ہے۔ ہمارا مقصد بھی قوم کی خدمت ہے۔"

بوڑھی بیوہ جنگ آزادی میں دل و جان سے شریک تھی۔ دس سال قبل اس کا شوہر ایک باغیانہ تقریر کرنے کے جرم میں سزایاب ہوا تھا۔ جیل میں اس کی صحت خراب ہو گئی۔ اور جیل ہی میں راہئ عدم ہوا۔ تب سے یہ بیوہ عفت آمیز خلوص و انہماک سے خدمتِ قوم میں مصروف تھی۔

شروع میں اس کا نوجوان فرزند بھی رضاکاروں میں شامل ہو گیا تھا۔ مگر ادھر پانچ مہینوں سے وہ اس نئی سبھا میں شریک ہو گیا۔ اور اس کے سرگرم کارکنوں میں سمجھا جاتا تھا۔

ماں نے مشتبہ انداز سے پوچھا۔ "تو تمہاری سبھا کا بھی کوئی دفتر ہے؟"

"ہاں ہے۔"

"اس میں کتنے ممبر ہیں؟"

"ابھی تو صرف پچیس ممبر ہیں۔ لیکن وہ پچیس آدمی جو کچھ کر سکتے ہیں۔ وہ تمہارے پچیس ہزار بھی نہیں کر سکتے۔ دیکھو اماں! کسی سے کہنا مت۔ ورنہ سب سے پہلے میری جان پر آفت آئے گی۔ مجھے امید نہیں، کہ پکٹنگ اور جلوسوں سے ہمیں آزادی حاصل ہو سکے۔ یہ تو اپنی کمزوری، اور معذوری کا صریح اعلان ہے۔ جھنڈیاں نکال کر اور گیت گا کر قومیں نہیں آزاد ہوا کرتیں۔ یہاں کے لوگ اپنی عقل سے کام نہیں لیتے۔ ایک آدمی نے کہا یوں سوراجیہ مل جائے گا۔ بس آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے ہو لئے۔ وہ آدمی گمراہ ہے۔ اور دوسروں کو بھی گمراہ کر رہا ہے۔ یہ لوگ دل میں اس خیال سے خوش ہو لیں۔ کہ ہم آزادی کے قریب آتے جاتے ہیں۔ مگر مجھے تو یہ طرز عمل بالکل بچوں کا کھیل معلوم ہوتا ہے۔ لڑکوں کے رونے دھونے اور مچلنے پر کھلونے اور مٹھائیاں ملا کرتی ہیں۔ وہی ان لوگوں کو مل جائے گا۔ اصلی چیز جب ہی ملے گی، جب ہم اس کی قیمت دینے کو تیار ہوں گے۔"

ماں نے کہا۔ "اس کی قیمت کیا ہم نہیں دے رہے ہیں؟ ہمارے

لاکھوں آدمی جیل نہیں گئے؟ ہم نے ڈنڈے نہیں کھائے؟ ہم نے اپنی جائدادیں نہیں ضبط کرائیں؟"

دھرم ویر:۔" اس سے انگریزوں کا کیا نقصان ہوا؟ وہ ہندوستان اسی وقت چھوڑیں گے۔ جب انہیں یقین ہو جائے گا، کہ اب وہ ایک لمحہ بھر بھی نہیں رہ سکتے۔ اگر آج ہندوستان کے ایک ہزار انگریز قتل کر دئے جائیں۔ تو آج ہی سوراجیہ مل جائے۔ روس اسی طرح آزاد ہوا۔ آئرلینڈ بھی اسی طرح آزاد ہوا۔ اور ہندوستان بھی اسی طرح آزاد ہو گا۔ اور کوئی طریقہ نہیں۔ ہمیں ان کا خاتمہ کر دینا ہے۔ ایک گورے افسر کے قتل کر دینے سے حکومت پر جتنا خوف طاری ہو جاتا ہے۔ اتنا ایک ہزار جلوسوں سے ممکن نہیں۔"

ماں سر سے پاؤں تک کانپ اٹھی۔ اسے بیوہ ہوئے دس سال ہو گئے تھے۔ یہی لڑکا اس کی زندگی کا سہارا ہے۔ اسی کو سینہ سے لگائے محنت مزدوری کر کے اپنے مصیبت کے دن کاٹ رہی ہے۔ وہ اس خیال سے خوش تھی، کہ یہ چار پیسے کمائے گا۔ گھر میں بہو آئے گی۔ ایک ٹکڑا کھاؤں گی۔ اور پڑی رہوں گی۔ آرزوؤں کے پتلے پتلے تنکوں سے اس نے ایک کشتی بنائی تھی۔ اور اسی پر بیٹھ کر زندگی کے دریا کو پار کر رہی تھی۔ وہ کشتی اب اسے لہروں میں جھکولے کھاتی معلوم ہوئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا، کہ وہ کشتی دریا میں ڈوبی جا رہی ہے۔ اس نے اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہا:۔

"بیٹا، تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو، انگریزوں کو قتل کر دینے سے ہم آزاد ہو جائیں گے؟ ہم انگریزوں کے دشمن نہیں۔ ہم اس

طرز حکومت کے دشمن ہیں ۔ اگر یہ طرز حکومت ہمارے بھائی بندوں ہی کے ہاتھوں میں ہو ۔ اور اس کا بہت بڑا حصّہ ہے بھی ۔ تو ہم اس کی بھی اسی طرح مخالفت کریں گے ۔ روس میں تو کوئی دوسری قوم راج نہ کرتی تھی ۔ پھر بھی روس والوں نے اس حکومت کو اُکھاڑ پھینکا ۔ تو اس کا سبب یہی تھا، کہ زار رعایا کی پروا نہ کرتا تھا ۔ اُمراء مزے اُڑا لیتے تھے ۔ غریبوں کو پیسا جاتا تھا ۔ یہ باتیں تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو ۔ وہی حال ہمارا ہے ۔ یہاں ایک ایک عہدے دار ایک ہزار غریبوں کا حصّہ کھا جاتا ہے ۔ ملک کی دولت ایک نہ ایک بہانے نکلتی چلی جاتی ہے ۔ اور ہم غریب ہوتے جاتے ہیں ۔ ہم اس غیر آئینی حکومت کو بدلنا چاہتے ہیں ۔ میں تمہارے پیروں پڑتی ہوں، اس سبھا سے اپنا نام کٹوا لو ۔ خواہ مخواہ آگ میں نہ کودو ۔ میں اپنی آنکھوں سے یہ نظارہ نہیں دیکھنا چاہتی ۔ کہ تم عدالت میں خون کے جرم میں لائے جاؤ ۔"

دھرم ویر پر اس منت آمیز التجا کا کوئی اثر نہ ہوا ۔ بولا ۔ " اس کا کوئی خوف نہیں ۔ ہم نے اس کے متعلق کافی احتیاط کر لی ہے ۔ گرفتار ہونا تو حماقت میں داخل ہے ۔ ہم لوگ ایسی حکمت سے کام کرنا چاہتے ہیں کہ کوئی گرفتار نہ ہو ۔"

ماں کے چہرے پر اب خوف کی جگہ شرمندگی کی جھلک نظر آئی ۔ بولی ۔ " یہ تو اس سے بھی بدتر ہے ۔ بے گناہ سزا پائیں اور قاتل چین سے بیٹھے رہیں ۔ یہ شرمناک حرکت ہے ۔ میں اسے کمینہ پن سمجھتی ہوں ۔ کسی کو چھپ کر قتل کرنا دغابازی ہے ۔ مگر اپنے عوض اپنے بے گناہ بھائیوں کو پھنسا دینا قوم فروشی ہے ۔ ان بے گناہوں کا خون بھی قاتل کی گردن پر ہو گا ۔"

دھرم ویر نے اپنی ماں کی پریشانی کا مزہ لیتے ہوئے کہا۔" اماں، تم ان باتوں کو نہیں سمجھتیں۔ تم اپنے دھرنے دئے جاؤ۔ جلوس نکالے جاؤ۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں، ہمیں کرنے دو۔ گناہ اور ثواب، پاپ اور پُن، دھرم اور ادھرم، یہ بے معنی الفاظ ہیں۔ جس کام کو تم گناہ سمجھتی ہو، اُسے میں عین ثواب سمجھتا ہوں۔ تمہیں کیسے سمجھاؤں، کہ یہ نسبتی الفاظ ہیں۔ تم نے بھگوت گیتا تو پڑھی ہے۔ کرشن بھگوان نے صاف کہا ہے۔ مارنے والا میں ہوں۔ جلانے والا میں ہوں۔ آدمی نہ کسی کو مار سکتا ہے۔ نہ جلا سکتا ہے۔ پھر کہاں رہا تمہارا گناہ؟ مجھے اس بات کی کیوں شرم ہو کہ میرے عوض کوئی دوسرا مجرم قرار دیا گیا۔ یہ انفرادی جنگ نہیں۔ انگلینڈ کی مجموعی طاقت سے جنگ ہے۔ میں مروں یا میرے عوض کوئی دوسرا مرے اس میں کوئی فرق نہیں۔ جو آدمی قوم کی زیادہ خدمت کر سکتا ہے۔ اُسے زندہ رہنے کا زیادہ حق ہے"

ماں حیرت سے لڑکے کا منہ دیکھنے لگی۔ اس سے مباحثہ کرنا بے سود تھا۔ اپنی دلیلوں سے وہ اُسے قائل نہ کر سکتی تھی۔ دھرم ویر کھانا کھا کر اُٹھ گیا مگر وہ مفلوج سی بیٹھی رہی۔ اس نے سوچا۔ کہیں ایسا تو نہیں، کہ وہ کسی کو قتل کر آیا ہو، یا قتل کرنے جا رہا ہو۔ اس خیال سے اس کے جسم میں رعشہ آ گیا۔ عام آدمیوں کی طرح قتل اور خون کی نفرت اس کے جسم کے ایک ایک ذرّہ میں بھری ہوئی تھی۔ اس کا اپنا فرزند قتل کا مرتکب ہو۔ اس سے زیادہ شرم، ذلت، حقارت اس کے لئے اور کیا ہو سکتی تھی۔ وہ قومی خدمت کے اس معیار پر جان دیتی تھی۔ جو تیاگ، بے نفسی، خلوص اور صاف دلی کی برکت ہے۔ اس کی نگاہ میں قوم کا خادم وہ تھا۔ جو حقیر ترین

مخلوق کا دل بھی نہ دُکھائے۔ بلکہ ضرورت پڑنے پر خوشی سے اپنے کو قربان
کر دے۔ اہنسا اس کے اخلاقی احساسات کا جزو اعظم تھی۔ اگر دھرم ویر کسی
غریب کی حمایت میں گولی کا نشانہ بن جاتا۔ تو وہ روتی ضرور۔ مگر گردن اُٹھاکر۔
اُسے روحانی صدمہ ہوتا۔ شاید اس صدمہ سے جان بر نہ ہوتی۔ مگر اس صدمہ میں
غرور شامل ہوتا۔ لیکن وہ کسی کا خون کر آئے۔ یہ عذابی قہر تھا۔ لعنت تھی۔ لڑکے
کو روکے کیسے؟ یہی سوال اس کے سامنے تھا۔ وہ یہ نوبت ہرگز نہ آنے دے گی
کہ اس کا فرزند خون کے جرم میں گرفتار ہو۔ نہ اُسے یہی برداشت تھی،
کہ اس کے جرم کی سزا بے گناہوں کو ملے۔ اُسے تعجب ہو رہا تھا،
لڑکے میں یہ شوریدہ سری آئی کیونکر؟ وہ کھانا کھانے بیٹھی۔ مگر لقمہ حلق میں
نہ جا سکا۔ کوئی ظالم ہاتھ دھرم ویر کو اس کی گود سے چھینے لیتا ہے۔ وہ
اس ہاتھ کو ہٹا دینا چاہتی تھی۔ اپنے لختِ جگر کو وہ ایک لمحہ کے لئے بھی جُدا
نہ کرے گی۔ سایہ کی طرح اس کے پیچھے رہے گی۔ کس کی مجال ہے جو اس
کے لڑکے کو اس کی گود سے چھینے؟

دھرم ویر باہر کے کمرے میں سویا کرتا تھا۔ اُسے گمان ہوا وہ کہیں
چلا نہ گیا ہو۔ فوراً اس کے کمرہ میں آئی۔ دھرم ویر کے سامنے چراغ دان پر
چراغ جل رہا تھا۔ وہ ایک کتاب کھولے پڑھتا پڑھتا سو گیا تھا۔ کتاب اس
کے سینے پر پڑی تھی۔ ماں نے وہیں بیٹھ کر بے کسانہ خلوص اور انکسار کے
ساتھ پرماتما سے اس کی تالیفِ قلب کے لئے دعا کی۔ اس کے چہرہ پر اب
بھی وہی بھولا پن، وہی معصومیت تھی۔ جو پندرہ بیس سال پہلے نظر آتی تھی۔
تندی یا کرختگی کا کوئی نشان نہ تھا۔ ماں کی اصول پروری ایک
لمحہ کے لئے ماما کے دامن میں چھپ گئی۔ ماں نے دل سے بیٹے

کے دلی جذبات کو دیکھا۔ اس نوجوان کے دل میں خدمت کا کتنا جوش ہے۔ قوم کا کتنا درد ہے۔ مظلومی سے کتنی ہمدردی ہے۔ اگر اس میں بوڑھوں کی مصلحت اندیشی، صبر، آہستہ روی ہے۔ تو اس کی کیا وجہ ہے۔ جو شخص جان جیسی عزیز چیز کو قربان کرنے کے لئے آمادہ ہو، اس کی تڑپ اور جلن کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ کاش! یہ جوش، یہ درد ہنسا کے پنجہ سے نکل سکتا۔ تو بیداری کی رفتار کتنی تیز ہو جاتی۔

ماں کی آہٹ پا کر دھرم ویر چونک پڑا۔ اور کتاب سنبھالتا ہوا بولا۔ "تم کب آگئیں اماں؟ مجھے تو نہ جانے کب نیند آگئی۔"

ماں نے چراغ دان کو دور ہٹا کر کہا "چارپائی کے پاس چراغ رکھ کر نہ سویا کرو۔ اس سے کبھی کبھی حادثے ہو جایا کرتے ہیں۔ اور کیا ساری رات پڑھتے ہی رہو گے۔ آدھی رات تو ہوئی۔ آرام سے سو جاؤ۔ میں بھی یہیں لیٹی جاتی ہوں، مجھے اندر نہ جانے کیوں ڈر لگتا ہے۔"

دھرم ویر "تو میں ایک چارپائی لا کر ڈالے دیتا ہوں۔"

"نہیں، میں یہیں زمین پر لیٹی جاتی ہوں۔"

"واہ! میں چارپائی پر لیٹوں، اور تم زمین پر پڑی رہو۔ تم چارپائی پر آ جاؤ۔"

"چل! میں چارپائی پر لیٹوں، اور تو زمین پر پڑا رہے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا۔"

"میں چارپائی لئے آتا ہوں۔ نہیں تو میں بھی اندر ہی لیٹتا ہوں، آج آپ ڈریں کیوں؟"

"تمہاری باتوں نے ڈرا دیا۔ تو مجھے بھی کیوں اپنی سمجھا میں نہیں

شریک کر لیتا۔"

دھرم ویر نے کوئی جواب نہ دیا۔ بستر اور چارپائی اُٹھا کر اندر والے کمرہ میں لے چلا۔ ماں آگے آگے چراغ دکھاتی ہوئی چلی۔ کمرہ میں چارپائی ڈال کر اس پر لیٹتا ہوا بولا۔" اگر تم میری سبھا میں شریک ہو جاؤ۔ تو کیا پوچھنا۔ بے چارے کچی کچی روٹیاں کھا کر بیمار ہو رہے تھے۔ انہیں اچھا کھانا ملنے لگے گا۔ پھر ایسی کتنی ہی باتیں ہیں جنہیں ایک بوڑھی عورت جتنی آسانی سے کر سکتی ہے۔ نوجوان ہرگز نہیں کر سکتے۔ مثلاً کسی معاملہ کا سُراغ لگانا، عورتوں میں ہمارے خیالات کی اشاعت کرنا۔ مگر تم مذاق کر رہی ہو۔"

ماں نے متانت سے کہا۔" نہیں بیٹا، مذاق نہیں کر رہی۔ دل سے کہہ رہی ہوں۔ ماں کا دل کتنا نازک ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ تم نہیں کر سکتے۔ تمہیں اتنے بڑے خطرے میں تنہا چھوڑ کر میں گھر میں نہیں بیٹھ سکتی۔ جب تک مجھے کچھ نہ معلوم تھا۔ دوسری بات تھی۔ لیکن اب یہ حالات جان لینے کے بعد میں تم سے علیحدہ نہیں رہ سکتی۔ میں ہمیشہ تمہارے پہلو میں رہوں گی۔ اور اگر کوئی ایسا موقعہ آیا، تو تم سے پہلے میں اپنے تئیں قربان کر دوں گی۔ مرتے وقت تم میرے سامنے ہو گے۔ میرے لئے یہی سب سے بڑی خوشی ہے۔ یہ مت سمجھو، کہ میں نازک موقعوں پر ڈر جاؤں گی۔ چیخوں گی۔ چلاؤں گی۔ ہرگز نہیں۔ سخت سے سخت خطروں کے سامنے بھی تم میری زبان سے ایک چیخ نہ سُنو گے۔ اپنے بچے کی حفاظت کے لئے گائے بھی شیرنی بن جاتی ہے۔"

دھرم ویر نے عقیدت سے سرشار ہو کر ماں کے قدموں کا بوسہ لے لیا۔ اس کی نگاہوں میں وہ کبھی اتنی تعظیم اور محبت کے قابل نہ تھی۔

۲

دوسرے ہی دن آزمائش کا موقعہ درپیش ہوا۔ یہ دو دن بڑھیا نے ریوالور چلانے کی مشق میں صرف کئے۔ پٹاخے کی آواز پر کانوں پر ہاتھ رکھنے والی، اہنسا اور دھرم کی دیوی، اتنی دلیری سے ریوالور چلاتی تھی۔ اور اس کا نشانہ اتنا بے خطا ہوتا تھا، کہ سبھا کے نوجوانوں کو بھی حیرت ہوتی تھی۔

پولیس کے افسر اعلیٰ کے نام موت کا پروانہ نکلا۔ اور یہ خدمت دھرم ویر کے سپرد ہوئی۔

دونوں گھر پہنچے۔ تو ماں نے پوچھا۔ "کیوں بیٹا" اس افسر نے تو کوئی ایسی حرکت نہیں کی۔ پھر سبھا نے کیوں اس کا انتخاب کیا؟"

دھرم ویر ماں کی سادگی پر مسکرا کر بولا۔ "تم سمجھتی ہو ہمارے کانسٹبل اور سب انسپکٹر اور سپرنٹنڈنٹ جو کچھ کرتے ہیں۔ اپنی خوشی سے کرتے ہیں؟ وہ لوگ جتنے مظالم کرتے ہیں، ان کے لئے یہی شخص ذمہ دار ہے۔ اور پھر ہمارے لئے تو اتنا ہی کافی ہے، کہ یہ اس مشین کا ایک خاص پُرزہ ہے۔ جو ہماری قوم کو انتہائی بے رحمی سے پامال کر رہی ہے۔ لڑائی میں ذاتیات سے کوئی سروکار نہیں۔ وہاں تو مخالف فریق کا ممبر ہونا ہی سب سے بڑا گناہ ہے۔"

ماں خاموش ہو گئی۔ ایک لمحہ کے بعد ڈرتے ڈرتے بولی۔ "بیٹا میں نے تم سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ اب ایک سوال کرتی ہوں۔ اُسے پورا

کرو گے؟"

دھرم ویر نے کہا۔

" یہ پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اماں تم جانتی ہو، میں تمہارے کسی حکم سے انکار نہیں کر سکتا۔"

ماں:۔" ہاں بیٹا، یہ جانتی ہوں، اسی وجہ سے مجھے یہ سوال کرنے کی جرأت ہوئی۔ تم اس سبھا سے الگ ہو جاؤ۔ دیکھو تمہاری بوڑھی ماں ہاتھ باندھ کر تم سے یہ عرض کر رہی ہے۔"

اور وہ ہاتھ باندھ کر سائلانہ انداز سے بیٹے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

دھرم ویر نے قہقہہ مار کر کہا۔

" یہ تو تم نے بے ڈھب سوال کیا اماں۔ تم جانتی ہو، اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔ زندہ لوٹ کر نہ آؤں گا۔ اگر یہاں سے کہیں بھاگ جاؤں۔ تو بھی جان نہیں بچ سکتی۔ سبھا کے سب ممبر ہی میرے خون کے پیاسے ہو جائیں گے۔ اور مجھے ان کی گولیوں کا نشانہ بننا پڑے گا۔ تم نے مجھے یہ زندگی عطا کی ہے اسے تمہارے قدموں پر نثار کر سکتا ہوں۔ لیکن مادرِ وطن نے تمہیں اور مجھے دونوں ہی کو زندگی عطا کی ہے۔ اور اس کا حق افضل ہے۔ اگر کوئی ایسا موقعہ ہاتھ آجائے۔ کہ مجھے مادر وطن کی حمایت کے لئے تمہیں قتل کرنا پڑے، تو میں اس ناگوار فرض سے بھی منہ نہ موڑ سکوں گا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہوں گے۔ لیکن تلوار تمہاری گردن پر ہو گی۔ ہمارے مذہب میں قوم کے مقابلہ میں کسی چیز کی حقیقت نہیں۔ اس لئے سبھا کو چھوڑنے کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ ہاں تمہیں خوف ہو تو میرے ساتھ نہ جاؤ۔ میں کوئی بہانہ کر دوں گا۔ اور کسی دوسرے کامریڈ کو ساتھ لے لوں گا۔ اگر تمہارے

دل میں ضعف ہو تو مجھے فوراً بتلا دو۔"

ماں نے کلیجہ مضبوط کر کے کہا "میں نے تمہارے خیال سے کہا تھا بھیا، ورنہ مجھے کیا خوف؟"

تاریک شب کے پردے میں اس مہم کو انجام دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ معتوب رات کو کلب سے جس وقت لوٹے۔ وہیں اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا جائے۔ دھرم ویر نے دوپہر ہی کو موقعہ کا معائنہ کر لیا۔ اس خاص مقام کا انتخاب کر لیا۔ جہاں سے وہ نشانہ مارے گا۔ صاحب کے بنگلہ کے قریب کریل اور کروندے کی ایک چھوٹی سی جھاڑی تھی۔ وہی اس کی کمین گاہ ہوگی۔ جھاڑی کے بائیں جانب نشیب تھا۔ نشیب میں بیر اور امرود کے باغ تھے۔ بھاگ نکلنے کا اچھا موقعہ تھا۔

صاحب کے کلب جانے کا وقت سات اور آٹھ بجے کے درمیان تھا۔ لوٹنے کا وقت گیارہ یا بارہ بجے تھا۔ ان اوقات کی تحقیق کر لی گئی تھی۔ دھرم ویر نے طے کیا کہ نو بجے چل کر اسی کروندے والی جھاڑی میں چھپ کر بیٹھ جائیں۔ وہیں ایک موڑ بھی تھا۔ موڑ پر موٹر کی رفتار کچھ سست ہو جائے گی۔ عین اسی وقت اسے ریوالور کا نشانہ بنا لیا جائے۔

جوں جوں دن گذرتا جاتا تھا۔ بوڑھی ماں کا دل دہشت سے خشک ہوتا جاتا تھا۔ لیکن دھرم ویر کے معمول میں مطلق فرق نہ تھا۔ وہ معین وقت پر اٹھا۔ ناشتہ کیا۔ سندھیا کی۔ حسب معمول کچھ دیر پڑھتا رہا۔ دو چار احباب آگئے۔ ان کے ساتھ دو تین بازیاں شطرنج کی کھیلیں۔ اطمینان

سے کھانا کھایا۔ اور معمول سے کچھ زیادہ۔ پھر آرام سے سو گیا۔ گویا اُسے کوئی غم نہیں ہے۔ ماں کا دل اُچاٹ تھا۔ کھانے پینے کا تو ذکر ہی گیا۔ وہ من مار کر ایک جگہ بیٹھ بھی نہ سکتی تھی۔ پڑوس کی عورتیں حسبِ معمول آئیں۔ وہ کسی سے مخاطب نہیں ہوئی۔ ایک سراسیمگی کے عالم میں ادھر ادھر دوڑتی پھرتی تھی۔ گویا چوہیا بلی کے خوف سے کوئی سوراخ ڈھونڈتی ہو۔ کوئی پہاڑ سا اس کے سر پر گرتا تھا۔ اس سے کہیں نجات نہیں۔ کہیں مفر نہیں وہ رسمی فلسفہ جس سے اب تک اُسے تسکین ہوتی تھی۔ تقدیر۔ پیر جنم، مشیّت اس بلائے مہیب کے سامنے بے کار سے معلوم ہوتے تھے۔ زرہ بکتر اور خود۔ تیر اور تفنگ سے حفاظت کر سکتے ہیں۔ لیکن پہاڑ تو اُسے اُن سارے دفاعی آلات کے ساتھ کچل ڈالے گا۔ اس کے دل و دماغ مفلوج ہوتے جاتے تھے۔ اگر کوئی احساس تھا، تو دہشت کا۔ مگر شام ہوتے ہوتے اس کے دل پر ایک سکون کی حالت طاری ہوئی۔ اس کے اندر ایک طاقت پیدا ہوئی۔ جسے مجبوری کی طاقت کہہ سکتے ہیں۔ چڑیا اس وقت تک پھڑپھڑاتی رہی۔ جب تک اُڑ نکلنے کی امید تھی۔ اس کے بعد وہ پنجۂ صیاد اور تیغِ قاتل کے لئے تیار ہو گئی۔ انتہائی خوف کا نام دلیری ہے۔

اس نے دھرم ویر کو پکارا۔ "بیٹا، کچھ آکر کھا لو۔"

دھرم ویر اندر آیا۔ آج دن بھر ماں بیٹے میں ایک بات بھی نہ ہوئی تھی۔ اس وقت ماں نے دھرم ویر کو دیکھا، تو اُس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ وہ ضبط جس سے آج اس نے دن بھر اپنے اندرونی اضطراب کو چھپا رکھا تھا۔ جو اب تک سُبکسری کی صورت میں نمایاں ہو رہا تھا۔ خطرہ کے

قریب آجانے پر گھبل گیا تھا۔ جیسے کوئی بچہ بھالو کو دور سے دیکھ کر تو خوشی سے تالیاں بجائے۔ لیکن اس کے قریب آنے پر چیخ اُٹھے۔

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں رونے لگے۔

ماں کا دل مسرّت سے کھل اُٹھا۔ اُس نے آنچل سے دھرم ویر کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا: "چلو بیٹا، یہاں سے کہیں بھاگ چلیں"

دھرم ویر خیال میں غرق کھڑا تھا۔ ماں نے پھر کہا: "کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں سے باہر نکل جائیں۔ جس میں کسی کو خبر بھی نہ ہو۔ قوم کی خدمت کرنے کے اور بھی بہت سے راستے ہیں"

دھرم ویر کی محویت بیدار ہوئی۔ بولا "یہ نہیں ہو سکتا اماں۔ فرض تو فرض ہے۔ اُسے ادا کرنا پڑے گا۔ چاہے رو کر ادا کروں یا ہنس کر۔ ہاں اس خیال سے وحشت ہوتی ہے، کہ انجام نہ جانے کیا ہو۔ ممکن ہے نشانہ خطا کر جائے۔ اور گرفتار ہو جاؤں۔ یا اس کی گولی کا نشانہ بنوں۔ لیکن ہرچہ بادا باد۔ مر بھی جائیں گے تو نام تو چھوڑ جائیں گے"

ایک لمحہ کے بعد اس نے پھر کہا:۔

"اس وقت تو کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا ماں، اب تیاری کرنی چاہیئے۔ تمہارا جی نہ چاہتا ہو، تو نہ چلو۔ میں اکیلا چلا جاؤں گا"

ماں نے شکوہ کے انداز سے کہا۔

"مجھے اپنی جان اتنی عزیز نہیں ہے بیٹا، میری جان تو تم تھے۔ تمہیں دیکھ کر جیتی تھی۔ تمہیں چھوڑ کر میری زندگی اور موت دونوں برابر ہیں۔ بلکہ موت زندگی سے بہتر ہے"

دھرم ویر نے کچھ جواب نہ دیا۔ دونوں اپنی اپنی تیاریوں میں مصروف ہوئے۔ ماں کی تیاری ہی کیا تھی۔ ایک بار ایشور کا دھیان کیا۔ ریوالور لیا۔ اور چلنے کو تیار ہو گئی۔

دھرم ویر کو اپنا روز نامچہ بھرنا تھا۔ وہ روز نامچہ بھرنے بیٹھا تو جذبات کا دریا اُمنڈ پڑا۔ یہ "روانی" یہ آمد اس کے لئے نئی چیز تھی جیسے دل میں کہیں سوتا کھل گیا ہو۔ انسان لافانی ہے۔ امر ہے۔ یہی اس "روانی" کا موضوع تھا۔ آغاز ایک دردناک الوداع سے ہوا۔

"رخصت! اے دنیا کی دلچسپیو رخصت! اے زندگی کی بہارو رخصت! اے زخم ہائے شیریں رخصت! برادرانِ وطن، اپنے اس محروم اور مجروح خادم کے لئے دعائے خیر نا! زندگی عزیز ہے۔ اس کا تجربہ ہوا۔ آہ! وہی غم و الم کے نشتر، وہی حسرتیں اور مایوسیاں، جنہوں نے زندگی کو تلخ کر رکھا تھا۔ فی الواقع سرمایۂ حیات ہیں۔ یہ نورِ سحر کی سُنہری بارش، یہ شام کی رنگین ہوائیں، یہ گلی کوچے، یہ در و دیوار دیکھنے پھر نہ نصیب ہوں گے۔ زندگی بندشوں کا نام ہے۔ بندشیں ایک ایک کر کے ٹوٹ رہی ہیں۔ حیات کا شیرازہ بکھرا جا رہا ہے۔ اے دل کی آزادی! آؤ تمہیں گورِ حسرت میں دفن کر دوں۔ خدا سے یہی دُعا ہے کہ اہل وطن پھلیں پھولیں۔ وطن سرسبز اور شاداب ہو۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ ہم کیا اور ہماری حقیقت ہی کیا۔ مگر گلشن بلبلوں سے خالی نہ رہے گا۔ میری اپنے بھائیوں سے اتنی ہی التجا ہے، کہ جس وقت آپ آزادی کے نغمے گائیں، تو اس غریب کو دُعائے خیر سے یاد کر لیں۔"

روز نامچہ بند کر کے اس نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ اور اُٹھ کھڑا

ہوا۔ کپڑے پہنے۔ ریوالور جیب میں رکھا، اور بولا۔" اب تو وقت ہوگیا اماں"!

ماں نے کچھ جواب نہ دیا۔ گھر سنبھالنے کی کسے پروا تھی۔ جو چیز جہاں پڑی تھی۔ وہیں پڑی رہی۔ یہاں تک کہ چراغ بھی گل نہ کیا گیا۔ دونوں خاموش گھر سے نکلے۔ ایک مردانہ وار قدم اُٹھاتا، دوسری متفکر اور مغموم اور بارِ مجبوری سے جھکی ہوئی، راستہ میں بھی تبادلۂ الفاظ نہ ہوا۔ دونوں نوشتۂ تقدیر کی طرح اٹل، خاموش اور سرگرم تھے۔ حصۂ نثر پُر شکوہ، قوی اور تحریکِ عمل مستحسن۔ حصۂ نظم درد، تاثیر اور التجا سے لرزاں۔

جھاڑی میں پہنچ کر دونوں چُپ چاپ بیٹھ گئے۔ کوئی آدھ گھنٹہ کے بعد صاحب کا موٹر نکلا۔ دھرم ویر نے غور سے دیکھا۔ موٹر کی رفتار سُست تھی۔ صاحب اور لیڈی دونوں بیٹھے تھے۔ نشانہ غیر متوقع تھا۔ دھرم ویر نے جیب سے ریوالور نکالا۔ ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور موٹر آگے نکل گیا۔

دھرم ویر نے کہا۔" یہ تم نے کیا کیا اماں؟ ایسا سُنہرا موقع پھر ہاتھ نہ آئے گا۔"

ماں نے کہا۔" موٹر میں میم بھی تھی۔ کہیں میم ہی کو گولی لگ جاتی تو؟"

" تو کیا مضائقہ تھا۔ ہمارے مذہب میں ناگ ناگن اور سنپولے میں کوئی بھی فرق نہیں۔"

ماں نے نفرت آمیز لہجہ میں کہا۔" تو تمہارا مذہب درندوں اور وحشیوں کا ہے۔ جو جنگ کے بنیادی اصولوں کی بھی پروا نہیں کرتا۔ عورت ہر ایک مذہب میں معصوم سمجھی گئی ہے۔ یہاں تک کہ وحشی بھی اس کا احترام کرتے ہیں۔"

"میں واپسی کے وقت ہرگز نہ چھوڑوں گا"

"میرے جیتے جی تم عورت پر ہاتھ نہیں اُٹھا سکتے"

"میں اس معاملے میں تمہاری پابندیوں کا غلام نہیں ہو سکتا"

ماں نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس نامردانہ ضرب سے اس کی ممتا ریزہ ریزہ ہوگئی۔ مشکل سے بیس منٹ گذرے ہوں گے، کہ وہی موٹر دوسری جانب سے آتا دکھائی دیا۔ دھرم ویر نے موٹر کو غور سے دیکھا۔ اور اچھل کر بولا:۔

"لو اماں، اب کی بار صاحب اکیلا ہے۔ تم بھی میرے ساتھ نشانہ لگانا"

ماں نے لپک کر دھرم ویر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور مجنونانہ تندی کے ساتھ اس کا ریوالور چھیننے لگی۔ دھرم ویر نے اس کو دھکا دے کر گرا دیا۔ اور ایک قدم ہٹ کر ریوالور سادھا۔ ایک سیکنڈ میں ماں اُٹھی۔ اسی وقت گولی چلی موٹر آگے نکل گئی۔ مگر ماں زمین پر پڑی تڑپ رہی تھی۔

دھرم ویر ریوالور پھینک کر ماں کے پاس گیا۔ اور گھبرا کر بولا "اماں کیا ہوا؟"

پھر یکایک اس سانحہ کا علم اس کے اندر چمک اُٹھا۔ وہ اپنی پیاری ماں کا قاتل ہے۔ اس کی فطرت کی ساری درشتی اور تیزی اور گرمی بجھ گئی۔ آنسوؤں کی بڑھتی ہوئی لرزش کو محسوس کرتا وہ نیچے جھکا۔ اور ماں کے چہرہ کی طرف اشک آلود پشیمانی سے دیکھ کر بولا۔

"یہ کیا ہو گیا اماں! ہائے تم کچھ بولتی کیوں نہیں۔ یہ کیسے ہو گیا؟ اندھیرے میں کچھ نظر بھی تو نہیں آتا۔ کہاں گولی لگی؟ کچھ بتاؤ۔ آہ! اس بدنصیب ہاتھوں تمہاری موت لکھی تھی۔ جس کو تم نے گود میں پالا۔ وہی تمہارا قاتل ہوا۔ کس کو

بُلاؤں۔ کوئی نظر بھی تو نہیں آتا؟"

ماں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میرا جنم سپھل ہوگیا بیٹا، تمہارے ہاتھوں میری مٹی اُٹھے گی۔ تمہاری گود میں مر رہی ہوں۔ سینہ میں زخم ہوگیا ہے۔ جونہی تم نے گولی چلائی، میں تمہارے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اب نہیں بولا جاتا، پرماتما تمہیں خوش رکھے۔ میری یہ دعا ہے۔ میں اور کیا کرتی بیٹا! ماں کی آبرو تمہارے ہاتھ میں ہے۔ میں تو چلی!"

ایک لمحہ کے بعد اس تاریک سناٹے میں دھرم ویر اپنی عزیز ماں کے تن نیم جاں کو گود میں لئے گھر چلا۔ تو اس کے ٹھنڈے تلووں سے اپنی آنسو بھری آنکھیں رگڑ کر روحانی مسرت سے بھری ہوئی خلش محسوس کر رہا تھا۔

کہ تمہیں رفیق حیات بنا کر میں وہ سب کچھ پا جاؤں گا۔ جس کا میں اپنے کو مستحق سمجھتا ہوں۔ تو میں اب تک کبھی کا تم سے اس کی التجا کر چکا ہوتا۔ لیکن تم نے کبھی میرے دل میں یہ اعتبار پیدا کرنے کی پروا نہ کی۔ میری نسبت بھی تمہیں یہ شک ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ تمہیں یہ شک کرنے کا میں نے کوئی موقعہ نہیں دیا۔ اور میں کہہ سکتا ہوں، کہ میں اس سے کہیں بہتر شوہر بن سکتا ہوں۔ جتنی تم بیوی بن سکتی ہو۔ میرے لئے صرف اعتبار کی ضرورت ہے۔ اور تمہارے لئے زیادہ وزنی اور زیادہ مادی چیزوں کی۔ میری مستقل آمدنی پانسو سے زیادہ نہیں تم اس پر قناعت نہ کرو گی۔ میرے لئے صرف اس اطمینان کی ضرورت ہے کہ تم میری اور صرف میری ہو۔ بولو منظور ہے؟"

مالتی کو امرناتھ پر رحم آ گیا۔ اس کی باتوں میں جو صداقت بھری ہوئی تھی۔ اس سے وہ انکار نہ کر سکی۔ اُسے یہ بھی یقین ہو گیا، کہ امرناتھ کی وفا میں لغزش نہ ہو گی۔ اُسے اپنے اوپر اتنا اعتماد تھا، کہ وہ لمبی رسی سے مضبوط جکڑ سکتی ہے۔ لیکن خود جکڑے جانے پر وہ اپنے کو آمادہ نہ کر سکی۔ اس کی زندگی محبت کی بازی گری میں، اُلفت کی نمائش میں گذری تھی۔ وہ کبھی اس کبھی اُس شاخ پر چہکتی پھرتی تھی۔ بے قید، آزاد، بے بند، کیا وہ طائرِ کنج قفس میں خوش رہ سکتا ہے۔ جس کی زبان انواع واقسام کے مزوں کی عادی ہو گئی ہو، کیا وہ نانِ خشک پر آسودہ ہو سکتا ہے؟

اس احساس نے اُسے نرم کر دیا۔ بولی:-

"آج تم بڑی علمیت بگھار رہے ہو؟"

امرناتھ۔ "میں نے تو صرف واقعات بیان کئے ہیں۔"

مالتی: "اچھا میں کل چلوں گی۔ مگر ایک گھنٹے سے زیادہ وہاں نہ رہوں گی۔"

امرناتھ کا دل شکریہ سے لبریز ہو گیا۔ بولا:۔

"میں تمہارا بے حد مشکور ہوں مالتی، اب میری آبرو بچ جائے گی۔ نہیں تو میرے لئے گھر سے نکلنا مشکل ہو جاتا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تم اپنا پارٹ کتنی خوبصورتی سے ادا کرتی ہو۔"

مالتی:۔ "اس کی طرف سے تم اطمینان رکھو۔ بیاہ نہیں کیا۔ مگر براتیں دیکھی ہیں۔ مگر میں ڈرتی ہوں، کہیں تم مجھ سے دغا نہ کر رہے ہو۔ مردوں کا کیا اعتبار؟"

امرناتھ نے خلوص دل سے کہا:۔

"نہیں مالتی، تمہارا شبہ بے بنیاد ہے۔ اگر یہ زنجیر پیروں میں ڈالنے کا آرزومند ہوتا، تو کبھی کا ڈال چکا ہوتا۔ پھر مجھ سے نفس کے بندوں کا وہاں گذر ہی کہاں؟"

۳

دوسرے دن امرناتھ دس بجے ہی درزی کی دکان پر جا پہنچے۔ اور سر پر سوار ہو کر کپڑے تیار کرائے۔ پھر گھر آ کر نئے کپڑے پہنے، اور مالتی کو بلانے چلے۔ وہاں دیر ہو گئی۔ اس نے ایسا بناؤ سنگار کیا۔ گویا آج بہت بڑا معرکہ سر کرنا ہے۔

امرناتھ نے کہا۔ "وہ حسین نہیں، جو تم اتنی تیاریاں کر رہی ہو۔"

مالتی نے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے کہا۔ "تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ چپ چاپ بیٹھے رہو۔"

امرناتھ۔ "لیکن دیر جو ہو رہی ہے۔"

مالتی۔ "کوئی مضائقہ نہیں"

خطرہ کے اس فطری احتمال نے جو عورتوں کے لئے مخصوص ہے مالتی کو زیادہ محتاط کردیا تھا۔ اب تک اس نے کبھی امرناتھ کی جانب خصوصیت کے ساتھ التفات نہ کیا تھا۔ اس سے بے پروائی سے سلوک کرتی تھی۔ لیکن کل امرناتھ کے بشرہ سے اسے ایک خطرہ کی اطلاع مل چکی تھی۔ اور وہ اس خطرہ کا اپنی پوری طاقت سے مقابلہ کرنا چاہتی تھی۔ دشمن کو حقیر اور بے چارا سمجھنا صنف نازک کے لئے مشکل ہے۔ آج امرناتھ کو اپنے ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر وہ اپنی گرفت کو مضبوط کر رہی تھی۔ اگر اس طرح اس کی چیزیں ایک ایک کر کے نکل گئیں۔ تو پھر وہ اپنا وقار کب تک قائم رکھ سکے گی؟ جس چیز پر اس کا قبضہ ہے۔ اس کی طرف کوئی آنکھ ہی کیوں اٹھائے؟ راجہ بھی تو ایک ایک انگلی زمین کے پیچھے جان دیتا ہے۔ وہ اس نے شکاری کو ہمیشہ کے لئے اپنے رستہ سے ہٹا دینا چاہتی تھی۔ اس کے جادو کو توڑ دینا چاہتی تھی۔

شام کو وہ غیرت حور بن کر اپنی خادمہ اور نوکر کو ساتھ لے امرناتھ کے گھر چلی۔ امرناتھ نے صبح دس بجے تک مردانے گھر کو زنانے پن کا رنگ دینے میں صرف کیا تھا۔ ایسی تیاریاں کر رکھی تھیں، گویا کوئی افسر معائنہ کرنے والا ہے۔ مالتی نے گھر میں قدم رکھا، تو اس کی صفائی اور سجاوٹ دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ زنانے حصہ میں کئی کرسیاں رکھی تھیں۔ بولی:۔

"اب لاؤ اپنی دیوی جی کو۔ مگر جلد آنا۔ ورنہ میں چلی جاؤں گی۔"

امرناتھ لپکے ہوئے ولایتی کپڑے کی دکان پر گئے۔ آج بھی دھرنا تھا۔

تماشائیوں کا وہی ہجوم - وہاں دیوی جی نہ تھیں - پشت کی جانب گئے - تو دیوی جی ایک لڑکی کے ساتھ اسی بھیس میں کھڑی تھیں -

امرناتھ نے کہا۔ "معاف کیجئے گا - مجھے دیر ہو گئی - میں آپ کے وعدہ کی یاد دلانے آیا ہوں "

دیوی جی نے کہا "میں تو آپ کا انتظار کر رہی تھی - چلو سمترا ذرا آپ کے گھر ہو آئیں - کتنی دور ہے ؟"

امرناتھ :- "بہت قریب ہے - ایک ٹانگہ کر لوں گا "

پندرہ منٹ میں امرناتھ دونوں کو لئے گھر جا پہنچے - مالتی نے دیوی جی کو دیکھا - اور دیوی جی نے مالتی کو - ایک کسی رئیس کا محل تھا - عالی شان دوسرا کسی فقیر کی کٹیا تھی ، مختصر اور حقیر - رئیس کے محل میں تکلف اور نمائش تھی - فقیر کی کٹیا میں سادگی - اور صفائی - مالتی نے دیکھا - معصوم دوشیزہ ہے جسے کسی صورت حسین نہیں کہہ سکتے - پر اس کی معصومیت اور سادگی میں جو کشش تھی - اس سے وہ غیر متاثر نہ رہ سکی - دیوی جی نے بھی دیکھا ، ایک تکلف پسند ، بے باک اور مغرور عورت ہے - جو کسی نہ کسی وجہ سے اس گھر میں بے گانہ سی معلوم ہو رہی ہے جیسے کوئی جنگلی جانور پنجرے میں آ گیا ہو -

امرناتھ سر جھکائے مجرموں کی طرح کھڑے تھے - اور ایشور سے دعا کر رہے تھے ، کہ کسی طرح آج پردہ رہ جائے -

دیوی نے آتے ہی کہا - "بہن ! آپ اب بھی سر سے پاؤں تک بدیشی کپڑے پہنے ہوئی ہیں ؟"

مالتی نے امرناتھ کی طرف دیکھ کر کہا "میں بدیشی اور دیسی کے پھیر میں

نہیں پڑتی - جو یہ لاکر دیتے ہیں، وہ پہنتی ہوں - لانے والے ہیں یہ، میں تھوڑی بازار جاتی ہوں"

دیوی نے گلہ آمیز نظروں سے امرناتھ کی طرف دیکھ کر کہا "آپ تو کہتے تھے، یہ ان کی فرمائش ہے - مگر آپ ہی کا قصور نکل آیا"

مالتی "تو میرے سامنے ان سے کچھ نہ کہو - تم بازار میں بھی دوسرے مردوں سے باتیں کر سکتی ہو - جب وہ باہر چلے جائیں، تو جتنا جی چاہے کہہ سن لینا - میں اپنے کانوں سے نہیں سننا چاہتی"

دیوی جی "میں کچھ کہتی نہیں، اور بہن جی میں کہہ ہی کیا سکتی ہوں - کوئی زبردستی تو ہے نہیں - صرف عرض کر سکتی ہوں"

مالتی "اس کے معنی یہ ہیں، کہ انہیں اپنے ملک کی بھلائی کا ذرا بھی خیال نہیں - اس کا ٹھیکہ تمہیں نے لے لیا ہے - پڑھے لکھے آدمی ہیں - دس آدمی عزت کرتے ہیں - اپنا نفع نقصان سمجھ سکتے ہیں - تمہیں مجاز نہیں، کہ انہیں اُپدیش دینے بیٹھو - یا سب سے زیادہ عقلمند تمہیں ہو؟"

دیوی جی "آپ میرا منشا غلط سمجھ رہی ہیں بہن!"

مالتی "ہاں غلط تو سمجھوں گی ہی - اتنی تمیز کہاں سے لاؤں، کہ آپ کی باتوں کا مطلب سمجھوں - کھدر کی ساڑھی پہن لی - جھولی لٹکالی - ایک بلا لگا لیا - بس اب اختیار ہے - جہاں چاہیں آئیں جائیں - جس سے چاہیں ہنسیں بولیں - گھر میں کوئی پوچھتا نہیں - تو جیل خانے کا بھی کیا ڈر؟ میں اسے ہرڈوں گا پن سمجھتی ہوں - جو شریفوں کی بہو بیٹیوں کے لئے جائز نہیں"

امرناتھ دل میں کٹے جا رہے تھے چھپنے کے لئے بل ڈھونڈ رہے تھے۔ دیوی کی پیشانی پر ذرا بل نہ تھا۔ لیکن آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔

امرناتھ نے مالتی سے ذرا تیز لہجہ میں کہا۔ "کیوں خواہ مخواہ کسی کا دل دکھاتی ہو۔ یہ دیویاں اپنا عیش و آرام چھوڑ کر یہ کام کر رہی ہیں۔ کیا تمہیں اس کی بالکل خبر نہیں؟"

مالتی۔ "رہنے دو۔ بہت تعریف نہ کرو۔ زمانہ کا رنگ ہی بدلا جا رہا ہے۔ میں کیا کروں گی۔ اور تم کیا کرو گے۔ تم مردوں نے عورتوں کو گھر میں اتنی بری طرح قید کیا، کہ آج وہ رسم و رواج، شرم و حیا کو چھوڑ کر نکل آئی ہیں۔ اور کچھ دنوں میں تم لوگوں کی حکومت کا خاتمہ ہوا جاتا ہے۔ ولایتی اور بدیشی تو دکھانے کے لئے ہے۔ اصل میں یہ آزادی کی خواہش ہے۔ جو تمہیں حاصل ہے۔ تم اگر دو چار شادیاں کر سکتے ہو، تو عورت کیوں نہ کرے۔ یہ ہے حقیقت، اگر آنکھیں ہیں، تو اب کھول کر دیکھو۔ مجھے وہ آزادی نہ چاہئے۔ یہاں تو لاج دھوتے ہیں۔ اور میں شرم و حیا کو اپنا سنگار سمجھتی ہوں۔"

دیوی جی نے امرناتھ کی طرف فریاد کی آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ "بہن نے عورتوں کو ذلیل کرنے کی قسم سی کھالی ہے۔ میں بڑی بڑی امیدیں لے کر آئی تھی۔ مگر شاید یہاں سے ناکام جانا پڑے گا۔"

امرناتھ نے وہ ساڑھی اسے دیتے ہوئے کہا۔ "نہیں بالکل ناکام تو آپ نہیں جائیں گی۔ ہاں متوقع کامیابی نہ ہوگی۔"

مالتی نے تحکمانہ انداز سے کہا۔ "وہ میری ساڑھی ہے۔ تم اسے

نہیں دے سکتے۔"

امرناتھ نے خفت آمیز لہجہ میں کہا:" اچھی بات ہے۔ نہ دونگا۔ دیوی جی ایسی حالت میں تو شاید آپ مجھے معاف کریں گی؟"

دیوی جی چلی گئیں۔ تو امرناتھ نے تیوریاں بدل کر کہا۔" یہ تم نے آج میرے منہ میں کالکھ لگا دی۔ تم اتنی بدتمیز اور بدزبان ہو۔ مجھے معلوم نہ تھا۔"

مالتی نے تند لہجہ میں کہا۔" تو اپنی ساڑھی اسے دے دیتی؟ میں ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہوں۔ اب تو بدتمیز بھی ہوں۔ بدزبان بھی۔ اس دن ان بُرائیوں میں سے ایک بھی نہ تھی۔ جب میری جوتیاں سیدھی کرتے تھے۔ اس چھوکری نے موہنی ڈال دی۔ جیسی روح، ویسے فرشتے ـــ مبارک ہو۔"

یہ کہتی ہوئی مالتی باہر نکلی۔ اس نے سمجھا تھا۔ چرب زبانی اور حُسن کی طاقت سے وہ اس دوشیزہ کو اُکھاڑ پھینکے گی۔ لیکن جب معلوم ہوا، کہ امرناتھ آسانی سے قابو میں آنے والا نہیں۔ تو اس نے پھٹکار بتائی۔ ان داموں اگر امرناتھ مل سکتا تھا۔ تو بُرا نہ تھا۔ اس سے زیادہ قیمت وہ ان کے لئے دے نہ سکتی تھی۔

امرناتھ اس کے ساتھ دروازے تک آئے۔ جب وہ ٹانگہ پہ بیٹھی تو منت کرکے بولے:۔

" یہ ساڑھی دے دو نا مالتی، میں تمہیں کل اس سے بدرجہا بہتر ساڑھی لا دوں گا۔"

مگر مالتی نے بے اعتنائی کے ساتھ کہا:" یہ ساڑھی تو اب لاکھ روپے

پر بھی نہیں دے سکتی۔"

امرناتھ نے تیوریاں بدل کر جواب دیا۔" اچھی بات ہے ۔ لے جاؤ۔ مگر یہ سمجھ لو۔ یہ میرا آخری تحفہ ہے۔"

مالتی نے ہونٹ چبا کر کہا۔" اس کی پروا نہیں، تمہارے بغیر میں مر نہ جاؤنگی اس کا تمہیں یقین دلاتی ہوں۔"

ادیب کی عزّت

صبح کے وقت حضرت قمر نے بیس دفعہ اُبالی ہوئی چائے کا پیالہ تیار کیا۔ اور بغیر چینی اور دودھ کے پی گئے۔ یہی ان کا ناشتہ تھا۔ دودھ اور چینی ان کے نزدیک ضروریاتِ زندگی میں نہ تھیں۔ گھر میں گئے ضرور، کہ بیوی کو جگا کر پیسے مانگیں۔ پر اُسے پھٹے میلے لحاف میں سوتے دیکھ کر جگانے کو جی نہ چاہا۔ سوچا شاید مارے سردی کے رات بھر نیند نہ آئی ہوگی۔ اس وقت جا کر آنکھ لگی ہے۔ کچّی نیند جگا دینا مناسب نہ تھا۔ چُپکے سے لوٹ گئے۔

چائے پی کر انہوں نے قلم دوات سنبھالی۔ اور وہ کتاب لکھنے میں محو ہو گئے۔ جو اُن کے خیال میں اس صدی کی بہترین تصنیف ہوگی۔ جس کی اشاعت اُن کو قعرِ گمنامی سے نکال کر شہرت اور ناموری کے آسمان پر پہنچا دیگی

آدھ گھنٹہ کے بعد بیوی آنکھیں ملتے ہوئے آ کر بولی :۔

"چائے پی چکے ؟"

قمر نے خوش ہو کر جواب دیا "ہاں پی چکا، بہت اچھی بنی تھی۔"

"مگر دودھ اور چینی کہاں سے لائے ؟"

"آج کل سادہ چائے اچھی معلوم ہوتی ہے۔ دودھ اور چینی ملانے سے چائے کا ذائقہ بگڑ جاتا ہے۔ ڈاکٹروں کی بھی یہی رائے ہے۔ یورپ میں تو دودھ کا بالکل رواج نہیں۔ یہ تو ہمارے ہاں کے چینی نواز رئیسوں کی ایجاد ہے۔"

"نہ جانے آپ کو پھیکی چائے کیونکر اچھی معلوم ہوتی ہے۔ مجھے جگا کیوں نہ لیا۔ پیسے تو رکھے تھے۔"

قمر نے جواب نہ دیا۔ اور پھر لکھنے لگے۔ جوانی ہی میں انہیں یہ بیماری لگ گئی تھی۔ اور آج بیس سال سے وہ اسے پالے ہوئے تھے۔ اس بے نیازی کی شان سے، جو ادیبوں کی امتیازی صفت ہے۔ انہوں نے کسبِ معاش کے کسی اور ذریعہ کی طرف توجہ نہ کی۔ اس بیماری میں جسم گھل گیا۔ صحت گھل گئی۔ اور چالیس سال کی عمر ہی میں بڑھاپے نے آ کر گھیر لیا۔ مگر یہ مرض لاعلاج ہے۔ طلوعِ آفتاب سے آدھی رات تک یہ ادب کا پُجاری دُنیا و مافیہا سے بے خبر، فکرِ سخن میں غرق رہتا۔ پر ہندوستان میں سرسوتی کی پوجا لکشمی کی ناراضی کے مترادف ہے۔ دل تو ایک ہی تھا۔ دونوں دیویوں کو ایک ساتھ کیوں کر خوش کرتے۔ اور لکشمی کی ناراضی صرف افلاس کی شکل و صورت ہی میں ظاہر نہ ہوتی تھی، بلکہ اس کی سب سے بھیانک صورت یہ تھی، کہ اخبارات و رسائل کے ایڈیٹر بھی دل کھول کر داد نہ دیتے تھے جیسے ساری دُنیا نے اُن کے خلاف سازش کر لی ہو۔ یہاں تک کہ انہیں اپنے اوپر مطلق اعتماد نہ تھا۔ اور اب انہیں یہ

شبہ ہونے لگا تھا۔ کہ میرے مضامین میں کوئی خوبی کوئی معنی ہی نہیں، اور یہ انکشاف بدرجہ غایت ہمت شکن تھا۔ یہ عمر عزیز یوں ہی تلف ہوگئی۔ یہ تسکین بھی نہیں، کہ دنیا نے ناقدری کی ہو۔ مگر ان کا کارنامۂ حیات حقیر نہیں۔ ضروریات زندگی گھٹتے گھٹتے زہد کی حدود کو بھی پار کر چکی تھیں۔ اگر کوئی تسکین تھی، تو محض یہ کہ اُن کی رفیقۂ حیات ترک و ایثار میں ان سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ سکینہ اس تباہ حالی میں بھی مطمئن تھی۔ قمر کو دنیا سے شکایت ہو۔ مگر سکینہ ہمیشہ اس کی دلجوئی کرتی رہتی تھی۔ اپنے نصیبوں کو رونا تو دور کی بات تھی۔ اس دیوی نے کبھی ماتھے پر بل بھی نہ آنے دیا۔ سکینہ نے چائے کا پیالہ سمیٹتے ہوئے کہا:۔

"تو جا کر گھنٹہ آدھ گھنٹہ کہیں گھوم پھر کیوں نہیں آتے۔ جب معلوم ہو گیا، کہ جان دے کر کام کرنے سے بھی کوئی نتیجہ نہیں، تو بیکار کیوں سر کھپاتے ہو؟"

قمر نے بغیر قلم اُٹھائے کہا۔ "لکھنے میں کم از کم یہ تسلّی تو ہوتی ہے کہ کچھ کر رہا ہوں۔ سیر کرنے میں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت ضائع ہو رہا ہے۔"

"یہ اتنے لکھے پڑھے آدمی جو ہر روز ہوا کھانے جاتے ہیں۔ تو یہ کیا اپنا وقت ضائع کرتے ہیں؟"

"مگر ان میں زیادہ تر وہی لوگ ہوتے ہیں۔ جن کو سیر کرنے سے مالی نقصان نہیں ہوتا۔ اکثر تو سرکاری ملازم ہوتے ہیں۔ جن کو ماہوار تنخواہ مل جاتی ہے۔ یا ایسے پیشوں کے لوگ ہوتے ہیں۔ جن کی عوام میں عزت ہے۔ میں تو مل کا مزدور ہوں۔ تم نے کبھی مزدوروں کو بھی ہوا کھاتے دیکھا ہے۔ جنہیں کھانے

کی کمی نہیں۔ ان کو ہوا کی ضرورت ہے جنہیں روٹیوں کے لالے ہیں۔ وہ ہوا کیا کھائیں گے؟ پھر تندرستی اور لمبی عمر کی بھی ان ہی کو ضرورت ہے۔ اس بار کو سر پر کچھ دن اور اُٹھائے رکھنے کی خواہش مجھے کیا ضرور ہے؟

سکینہ نے مایوسی میں ڈوبی ہوئی باتیں سُن کر آنکھوں میں آنسو بھرے اور اندر چلی گئی۔ اس کا دل کہتا تھا۔ اس تپ کا پھل ایک دن انہیں ضرور ملے گا۔ دولت حاصل ہو یا نہ ہو۔ لیکن قمر صاحب یاس کی اس حد تک جا پہنچے تھے، جہاں سے سمتِ مخالف میں طلوع ہونے والی امید کی سُرخی بھی نہیں دکھائی دیتی۔

۲

ایک رئیس کے یہاں کوئی تقریب ہے۔ اس نے حضرتِ قمر کو بھی مدعو کیا ہے۔ آج ان کا دل خوشی کے گھوڑے پر بیٹھا ہوا ناچ رہا ہے۔ سارے دن وہ اسی تخیّل میں محو رہے۔ راجہ صاحب کن الفاظ میں ان کا خیر مقدم کریں گے۔ اور وہ کن الفاظ میں ان کا جواب دیں گے۔ کن مضامین پر گفتگو ہو گی۔ اور کن کن اصحاب سے ان کا تعارف کرایا جائے گا۔ سارا دن وہ انہی خیالات کے لطف اُٹھاتے رہے۔ اس موقع کے لئے انہوں نے ایک نظم بھی تیار کی۔ جس میں انہوں نے زندگی کو ایک باغ سے تشبیہہ دی تھی۔ سرابِ ہستی ان کے زورِ طبع کے لئے زیادہ موزوں چیز تھی۔ مگر وہ آج رئیسوں کے جذبات کو ٹھیس نہ لگا سکتے تھے۔

دوپہر ہی سے انہوں نے تیاریاں شروع کیں۔ حجامت بنائی۔ صابن سے نہائے۔ سر میں تیل ڈالا۔ دقّت کپڑوں کی تھی۔ مدّت گذری، جب

انہوں نے ایک اچکن بنوائی تھی۔ اس کی حالت بھی ان کی سی تھی جیسے ذرا سی سردی یا گرمی سے اُنہیں زکام یا سر درد ہو جاتا تھا۔ اسی طرح وہ اچکن بھی نازک مزاج تھی۔ اُسے نکالا۔ اور جھاڑ پونچھ کر رکھا۔

سکینہ نے کہا "تم نے ناحق وہاں جانا منظور کیا۔ لکھ دیتے۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ ان پھٹے حالوں جانا تو اور بھی بُرا ہے۔"

قمر نے فلاسفروں کی سی سنجیدگی سے کہا۔ "جنہیں خدا نے دل اور سمجھ دی ہے۔ وہ آدمیوں کا لباس نہیں دیکھتے۔ ان کے ہنر دیکھتے ہیں۔ آخر کچھ بات تو ہے کہ راجہ صاحب نے مدعو کیا ہے۔ میں کوئی عہدے دار نہیں۔ زمیندار نہیں، جاگیر دار نہیں۔ ٹھیکہ دار نہیں، معمولی ایک شاعر ہوں۔ شاعر کی قیمت اس کی نظمیں ہوتی ہیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے مجھے کسی شاعر کے سامنے نادم ہونے کی ضرورت نہیں۔"

سکینہ ان کی سادگی پر ترس کھا کر بولی "تم خیالات کی دنیا میں رہتے رہتے حقیقی دنیا سے بالکل بے گانہ ہو گئے ہو۔ میں کہتی ہوں۔ راجہ صاحب کے یہاں لوگوں کی نگاہ سب سے زیادہ کپڑوں ہی پر پڑے گی۔ سادگی ضرور اچھی چیز ہے۔ لیکن اس کے معنیٰ یہ تو نہیں، کہ آدمی بیوقوف ہی بن جائے۔"

قمر کو اس دلیل میں کچھ جان نظر آئی۔ اہل نظر کی طرح انہیں اپنی غلطیوں کے اعتراف میں پس و پیش نہ ہوتا تھا۔ بولے:-

"میرا خیال ہے۔ چراغ جل جانے کے بعد جاؤں۔"

"میں تو کہتی ہوں۔ جاؤ ہی کیوں؟"

"اب تم کو کیسے سمجھاؤں۔ ہر شخص کے دل میں اعزاز و احترام کی بھوک ہوتی ہے۔ تم پوچھو گی۔ یہ بھوک کیوں ہوتی ہے؟ اس لئے کہ یہ

ہماری روح کے ارتقا کی ایک منزل ہے۔ ہم اس عظیم الشان طاقت کا لطیف حصّہ ہیں۔ جو ساری دنیا میں حاضر و ناظر ہے۔ جزو میں کُل کی خوبیاں ہونا لازمی امر ہے۔ اس لئے جاہ و رفعت، علم و فضل کی جانب ہمارا فطری میلان ہے۔ میں اس ہوس کو معیوب نہیں سمجھتا۔ ہاں چونکہ دل میں ضعف ہے۔ اہل دنیا کی حرف گیریوں کا خیال قدم قدم پر دامنگیر ہو جاتا ہے۔"

سکینہ نے گلا چھڑانے کے لئے کہا۔ "اچھا بھئی جاؤ۔ میں تم سے بحث نہیں کرتی۔ لیکن کل کے لئے کوئی سبیل سوچتے جاؤ۔ کیونکہ میرے پاس صرف ایک آنہ اور رہ گیا ہے۔ جن سے قرض مل سکتا تھا۔ اُن سے لے چکی، اور جس سے لیا، اُسے دینے کی نوبت نہیں آئی۔ مجھے تو اب اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔"

قمر نے ایک لمحہ کے بعد کہا۔ "دو ایک اخباروں سے روپیہ آنے والا ہے۔ شاید کل تک آ جائے۔ اور اگر فاقہ کشی ہی کرنی پڑے، تو کیا فکر ہے۔ ہمارا فرض کام کرنا ہے۔ ہم کام کرتے ہیں۔ اور دل و جان سے کرتے ہیں۔ اگر اس کے باوجود فاقہ کرنا پڑے، تو میرا قصور نہیں۔ مر ہی تو جاؤں گا۔ ہمارے جیسے لاکھوں آدمی آئے دن مرتے رہتے ہیں۔ دنیا کا کوئی کام بند نہیں ہوتا۔ میں تو کبیر پنتھیوں کا قائل ہوں۔ جو گاتے بجاتے ہوئے جنازے کو لے جاتے ہیں۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ تم ہی کہو میں جو کچھ کرتا ہوں۔ اس سے زیادہ میرے امکان میں کیا ہے؟ ساری دُنیا میٹھی نیند سوتی ہے۔ اور میں قلم لئے بیٹھا رہتا ہوں۔ لوگ سیر و تفریح کرتے ہیں، کھیلتے کودتے ہیں۔ میرے لئے سب کچھ حرام ہے۔ یہاں

تک کہ بہنوں سے ہنسنے کی نوبت نہیں آئی۔ عید کے دن بھی میں نے تعطیل نہیں منائی۔ بیمار ہوتا ہوں۔ جب بھی لکھتا ہوں۔ سوچو تم بیمار تھیں۔ اور میرے پاس حکیم کے پاس جانے کے لئے بھی وقت نہ تھا۔ اگر دنیا نہیں قدر کرتی، نہ کرے۔ اس میں دُنیا ہی کا نقصان ہے۔ میرا تو کوئی نقصان نہیں۔ چراغ کا کام جلنا ہے۔ اس کی روشنی پھیلتی ہے۔ یا اس کے سامنے کوئی دیوار ہے۔ اسے اس سے مطلب نہیں۔ میرا بھی ایسا کون دوست، شناسا یا رشتہ دار ہے۔ جس کا میں شرمندۂ احسان نہیں یہاں تک کہ اب گھر سے نکلتے بھی شرم آتی ہے۔ اطمینان صرف اتنا ہے کہ لوگ مجھے بدنیت تصوّر نہیں کرتے۔ خواہ وہ میری کچھ زیادہ امداد نہ کرسکیں مگر انہیں مجھ سے ہمدردی ہے۔ میری خوشی کے لئے اسی قدر کافی ہے کہ آج مجھے ایک رئیس نے بُلایا ہے"

پھر معاً اُن پر نشہ سا چھا گیا۔ غرور سے بولے :۔

"نہیں اب رات کو نہ جاؤں گا۔ میرا افلاس رسوائی کی حد تک پہنچ چکا ہے۔ اس کی پردہ پوشی بیکار ہے۔ میں اسی وقت جاؤں گا جسے راجہ لوگ مدعو کریں۔ وہ ایسا ویسا آدمی نہیں ہو سکتا۔ راجہ صاحب معمولی رئیس نہیں۔ وہ اسی شہر کے نہیں۔ ہندوستان بھر کے مشہور آدمی ہیں۔ اگر اب بھی کوئی مجھے معمولی آدمی سمجھے، تو اس کی عقل کا فتور ہے۔"

۳

شام کے وقت حضرتِ قمر اپنی پھٹی پُرانی اچکن، اور سڑے ہوئے جوتے، اور بے تکی سی ٹوپی پہنے گھر سے نکلے۔ تو گزار چکے سے معلوم

ہوتے تھے۔ ڈیل ڈول اور چھریرے بھرے کے آدمی ہوتے۔ تو اس ٹھاٹھ میں بھی ایک شان ہوتی۔ فربہی بجائے خود ایک بارُعب شے ہے۔ مگر ادبی خدمت اور فربہی میں خدا واسطے کا بیر ہے۔ اگر کوئی ادیب موٹا تازہ ہے، تو سمجھ لیجیے، کہ اس میں سوز نہیں۔ لوچ نہیں، دل نہیں۔ پھر بھی اکڑے جاتے تھے۔ ایک ایک عضو سے غرور ٹپکتا تھا۔

یوں گھر سے نکل کر وہ دکان داروں سے آنکھ بچا کر نکل جاتے تھے۔ مگر آج وہ گردن اُٹھائے ان کے سامنے سے جا رہے تھے۔ آج وہ ان کے تقاضوں کا دنداں شکن جواب دینے کو تیار تھے۔ مگر شام کا وقت تھا۔ ہر ایک دکان پر خریداروں کا ہجوم تھا۔ کوئی ان کی طرف نہیں دیکھتا۔ جس رقم کو وہ بہت زیادہ سمجھتے تھے۔ وہ دکان داروں کی نگاہوں میں معمولی تھی۔ کم از کم ایسی نہ تھی۔ جس کی خاطر وہ کسی کی عزت اُتار کر رکھ دیں۔ حضرتِ قمر نے ایک مرتبہ سارے بازار کا چکر لگایا۔ پر جی نہ بھرا۔ تب دوسرا چکر لگایا۔ اس سے بھی کچھ نہ بنا۔ تب وہ خود حافظ صمد کی دکان پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ حافظ صاحب بساطی کا کام کرتے تھے۔ بہت دن ہوئے۔ قمر کو دیکھ کر بولے "واہ حضرت، ابھی تک چھلے کے دام نہیں ملے۔ ایسے سوپچاس گاہک مل جائیں، تو دیوالہ نکل جائے۔ اب تو دن بہت ہو گئے۔"

حضرتِ قمر کی باچھیں کھل گئیں۔ دل کی مراد پوری ہوئی۔ بولے "میں بھولا نہیں ہوں حافظ صاحب، ان دنوں کام کی اس قدر زیادتی رہی۔ کہ گھر سے نکلنا دشوار تھا۔ روپیہ تو ہاتھ نہیں آتا۔ پر آپ کی دُعا سے قدرشناسوں کی کمی نہیں۔ دو چار آدمی گھیرے ہی رہتے ہیں۔ زندگی وبال ہے۔ اس وقت

بھی راجہ صاحب ...... اجی وہی جو نکڑ والے بنگلے میں رہتے ہیں
انہیں کے یہاں جا رہا ہوں۔ روز کوئی نہ کوئی ایسا ہی موقع آتا
رہتا ہے؟

حافظ صاحب مرعوب ہو گئے۔" اچھا، آپ راجہ صاحب کے ہاں
تشریف لے جا رہے ہیں؟ ٹھیک ہے۔ آپ جیسے باکمالوں کی قدر
رئیس ہی کر سکتے ہیں۔ اور کون کرے گا۔ سبحان اللہ! آپ اس وقت
یکتا ہیں۔ اگر کوئی موقع ہاتھ آئے۔ تو غریب کو بھول نہ جایئے گا۔
راجہ صاحب کی اگر ادھر نگاہ ہو جائے، تو پھر کیا پوچھنا، ایک
پورا بساط خانہ تو ان ہی کے لئے درکار ہے۔ ڈھائی تین لاکھ سالانہ
کی آمدنی ہے۔"

قمر صاحب کو ڈھائی تین لاکھ کی آمدنی حقیر سی معلوم ہوئی۔ زبانی جمع
خرچ ہے۔ تو بیس لاکھ کہنے میں کیا حرج ہے؟ بولے۔" ڈھائی
تین لاکھ، آپ تو انہیں گالیاں دیتے ہیں۔ ان کی آمدنی دس لاکھ سے
کم نہیں۔ ایک صاحب کا اندازہ تو بیس لاکھ کا ہے۔ مکان ہیں۔ دکانیں ہیں۔
ٹھیکہ ہے۔ امانتی روپے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سرکار
بہادر کی نگاہ ہے۔"

حافظ نے بڑے عجز سے کہا۔" یہ دکان آپ کی ہے جناب۔ بس
اتنی ہی عرض ہے۔ اے مرادی، ذرا دو پیسے کے اچھے پان تو بنوالا۔ آپ
کے لئے۔ آیئے دو منٹ بیٹھئے۔ کوئی چیز دکھاؤں گا۔ آپ سے تو گھر کا
معاملہ ہے۔"

قمر نے پان کھاتے ہوئے کہا۔" اس وقت تو معاف رکھئے۔ وہاں

دیر ہو گئی۔ پھر کبھی حاضر ہوں گا۔"

یہاں سے اُٹھ کر وہ ایک کپڑے والے کی دُکان پر رُکے۔ منوہر داس نام تھا۔ انہیں دیکھ کر آنکھیں اُٹھائیں۔ بے چارہ ان کے نام کو رو بیٹھا تھا۔ سوچتا تھا شاید کہیں چلے گئے۔ سمجھا روپے دینے آئے ہیں۔ بولا:۔

"بھائی، آپ نے تو بہت دنوں سے درشن ہی نہیں دئے۔ کئی بار رقعہ بھیجا۔ مگر آدمی کو آپ کے مکان کا پتہ نہ ملا۔ منیم جی، ذرا دیکھو تو آپ کے نام کیا نکلتا ہے؟"

قمر کی روح تقاضوں سے کانپتی تھی۔ لیکن آج اس طرح بے فکر کھڑے تھے۔ جیسے کوئی آہنی خود پہن لیا ہو۔ جس پر کوئی ہتھیار کارگر نہیں ہوتا۔ بولے "ذرا راجہ صاحب کے یہاں ہو آؤں۔ تو بے فکر ہو کر بیٹھوں۔ اس وقت وقت نہیں۔ جلدی ہی ہوں۔"

راجہ صاحب پر منوہر داس کے کئی ہزار روپے نکلتے تھے۔ پھر بھی ان کا دامن نہ چھوڑتا تھا۔ ایک کے تین وصول کرتا۔ اس نے قمر کو بھی اسی جماعت میں رکھ لیا۔ جس کا پیشہ رئیسوں کو لوٹنا ہے۔ بولا:۔

"پان تو کھاتے جائیے۔ جناب راجہ صاحب ایک دن کے ہیں۔ ہم تو بارہ مہینوں کے ہیں۔ کچھ کپڑا درکار ہو، تو لے جائیے۔ عید آ رہی ہے۔ موقعہ ملے تو راجہ صاحب کے خزانچی سے کہنا۔ "پرانا حساب بہت دنوں سے پڑا ہے۔ اب تو صاف ہو جائے۔ اب ہم ایسا کون سا نفع لے لیتے ہیں۔ کہ دو دو سال تک حساب ہی نہ ہو۔"

قمر بولے:۔ "اس وقت تو پان وان رہنے دو بھائی۔ دیر ہو جائیگی۔

جب انہیں مجھ سے ملنے کا اس قدر اشتیاق ہے۔ اور میرا اتنا ادب کرتے ہیں۔ تو میرا بھی فرض ہے، کہ انہیں تکلیف نہ ہونے دوں۔ ہم تو قدر دانی چاہتے ہیں۔ دولت کے بھوکے نہیں۔ کوئی ہمیں چاہے، تو ہم اس کے غلام ہیں۔ کسی کو ریاست کا غرور ہے، تو ہمیں بھی اپنے علم و کمال کا غرور ہے۔"

۴

حضرت قمر راجہ صاحب کے بنگلے کے سامنے پہنچے۔ تو دیے جل چکے تھے۔ امیروں اور رئیسوں کی موٹریں کھڑی تھیں۔ دروازے پر وردی پوش دربان کھڑے تھے۔ ایک صاحب مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ قمر کو دیکھ کر وہ جھجکے۔ پھر انہیں سر سے پاؤں تک دیکھ کر بولے "آپ کے پاس کارڈ ہے؟"

قمر صاحب کی جیب میں کارڈ تھا۔ مگر اس مطالبے پر انہیں غصہ آ گیا۔ اُنہی سے کیوں "کارڈ" مانگا گیا؟ اوروں سے تو کوئی پوچھتا نہیں۔ بولے:۔

"میرے پاس تو کوئی کارڈ نہیں۔ اگر آپ دوسروں سے کارڈ مانگتے، تو میں بھی دکھا دیتا۔ ورنہ میں اسے اپنی توہین سمجھتا ہوں۔ آپ راجہ صاحب سے کہہ دیجئے گا۔ قمر آیا تھا۔ لوٹ گیا۔"

وہ صاحب بولے۔ "نہیں نہیں جناب، اندر چلئے، آپ سے تعارف نہ تھا۔ معاف فرمایئے۔ آپ ہی جیسے اصحاب سے تو محفل کی رونق ہے، خدا نے آپ کو وہ کمال عطا فرمایا ہے کہ سبحان اللہ!"

اس شخص نے قمر کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ مگر اس نے جو کچھ کہا۔ وہ ہر ایک مصنف، ہر ایک شاعر کے متعلق کہا جا سکتا ہے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ کوئی

ادیب اس داد سے مستغنی نہیں۔

قمر اندر پہنچے۔ تو دیکھا۔ کہ بارہ دری کے سامنے وسیع اور آراستہ احاطہ میں بجلی کے لیمپ روشن ہیں۔ وسط میں ایک حوض ہے۔ اور حوض میں سنگ مرمر کی ایک پری۔ پری کے سر پر فوّارہ۔ فوّارے کی پھواریں رنگین لیمپوں سے رنگین ہو کر ایسی معلوم ہوتی تھیں، جیسے قوس قزح پگھل کر برس رہا ہو۔ حوض کے چاروں طرف میزیں لگی تھیں۔ میزوں پر سفید میزپوش ان پر خوبصورت گلدستے......

قمر کو دیکھتے ہی راجہ صاحب نے خیر مقدم کیا: "آیئے آیئے۔ اب کے انیس ہند میں آپ کی نظم دیکھ کر تو دل خوش ہو گیا۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ اس شہر میں آپ جیسے رتن بھی چھپے ہوئے ہیں"

پھر بیٹھے ہوئے احباب سے ان کا تعارف کرانے لگے۔ "آپ نے حضرتِ قمر کا نام تو سُنا ہوگا؟ وہ آپ ہی ہیں۔ کیا شیرینی ہے۔ کیا جدّت ہے۔ کیا تخیل ہے۔ کیا روانی ہے۔ کیا ندرت ہے کہ واہ وا! میرا دل تو آپ کی چیزیں پڑھ کر ناچنے لگتا ہے"

ایک صاحب نے جو انگریزی سوٹ میں تھے۔ قمر کو ایسی نگاہوں سے دیکھا۔ گویا وہ چڑیا گھر کا کوئی جانور ہو۔ اور بولے۔ "آپ نے انگریزی شاعری کا بھی مطالعہ کیا؟ بائرن، شیلے، ٹینیسن وغیرہ"

قمر نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ "جی ہاں، تھوڑا بہت دیکھا ہے"

"آپ ان استادانِ فن کی کتابوں میں سے کسی کا ترجمہ کر دیں تو آپ اپنی زبان کی بڑی خدمت کریں"

قمر اپنے آپ کو بائرن، شیلے سے جو بھر کم نہ سمجھتے تھے۔ بولے۔ "ہمارے

یہاں روحانیت کا ابھی اتنا فقدان نہیں ہوا۔ کہ مغربی شاعروں سے بھیک مانگیں۔ میرا خیال ہے۔ کم از کم اس مضمون میں ہم اب بھی مغرب کو بہت کچھ سِکھا سکتے ہیں۔"

انگریزی پوشش صاحب نے قمر کو پاگل سمجھا۔ راجہ صاحب نے قمر کو ایسی نگاہوں سے دیکھا۔ گویا کہہ رہے ہوں۔ ذرا موقعہ و محل دیکھ کر باتیں کرو۔ اور بولے۔" انگریزی لٹریچر کا کیا کہنا۔ شاعری میں تو اس کا جواب نہیں ہے۔"

انگریزی پوشش و۔" ہمارے شاعروں کو ابھی تک اتنا بھی معلوم نہیں' کہ شاعری کے کیا معنے ہیں۔ وہ ابھی تک ہجر و وصال کو شاعری کا منتہائے مقصود سمجھے بیٹھے ہیں۔"

قمر نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔" میرا خیال ہے، آپ نے ہندوستانی شعراء کا کلام ابھی تک دیکھا ہی نہیں۔ اور اگر دیکھا ہے تو سمجھا نہیں۔"

راجہ صاحب نے قمر کا منہ بند کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بولے۔" آپ مسٹر پرانجپے ہیں۔ آپ کے مضامین انگریزی اخبارات میں شائع ہوتے ہیں۔ اور لوگ انہیں بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔"

اس کے معنے یہ تھے، کہ اب آپ زیادہ نہ بہکئے۔ غریب قمر کو پرانجپے کے سامنے نیچا دیکھنا پڑا۔ ایک اور دیسی صاحب آئے۔ راجہ صاحب نے تپاک سے ان کا بھی استقبال کیا۔" آیئے ڈاکٹر چڈھا' مزاج تو اچھے ہیں؟"

چڈھا صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے ہاتھ ملایا۔ اور قمر کی طرف دیکھ

کر بولے:-

"آپ کی تعریف؟"

راجہ صاحب نے قمر کا تعارف کرایا: "آپ حضرت قمر شاعر ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے خاص انداز سے کہا:-

"اچھا، آپ شاعر ہیں!" اور بغیر کچھ کہے سنے آگے بڑھ گئے۔

یہ تماشہ کئی مرتبہ ہوا۔ اور ہر بار قمر کو یہی داد ملی "اچھا آپ شاعر ہیں!"

یہ الفاظ ہر مرتبہ قمر کے دل پر نیا صدمہ پہنچاتے تھے۔ ان کا باطنی مفہوم قمر سے چھپا نہ تھا۔ ان کا عام فہم الفاظ میں یہ مطلب تھا: "تم اپنے خیالی پلاؤ پکاتے ہو۔ پکاؤ۔ یہاں تمہارا کیا کام؟ تمہارا اتنا حوصلہ کہ اس محفل میں چلے آؤ۔"

قمر اپنے اوپر جھنجلا رہے تھے۔ دعوتی کارڈ پا کر وہ پھولے نہ سمائے تھے۔ لیکن یہاں آ کر ان کی جس قدر تذلیل ہوئی۔ اس کو دیکھ کر اپنا اطمینان کا جھونپڑا جنت سے کم نہ تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو طعن کی: "تمہارے جیسے عزت کے ہوس مندوں کی یہی سزا ہے۔ اب تو آنکھیں کھلیں، کہ تم کتنی عزت کے مستحق ہو۔ تم خود اس غرض مند دنیا میں کسی کے کام نہیں آ سکتے۔ وکیل، بیرسٹر تمہارا احترام کیوں کریں؟ تم ان کے مؤکل نہیں ہو سکتے۔ ڈاکٹر اور حکیم تمہاری طرف کیوں دیکھیں؟ انہیں بغیر فیس کے تمہارے گھر آنے کی ضرورت نہیں۔ تم لکھنے کے لئے بنے ہو۔ لکھتے جاؤ۔ بس دنیا میں تمہارا اور کوئی مصرف نہیں۔"

یکایک لوگوں میں ہل چل مچ گئی۔ آج کا جلسہ جن صاحب کے اعزاز

میں تھا۔ وہ آگئے۔ یہ صاحب یورپ سے کوئی بڑی ڈگری لے کر آئے تھے۔

راجہ صاحب نے لیک کران سے ہاتھ ملایا۔ اور قمر سے بولے "آپ اپنی نظم تو لکھ ہی لائے ہوں گے؟"

قمر نے جواب دیا "میں نے کوئی نظم تیار نہیں کی۔"

"سچ! تب تو آپ نے غضب ہی کر ڈالا۔ ارے بھلے آدمی، تو اب ہی بیٹھ کر کوئی چیز لکھ لو۔ دو چار شعر ہی ہو جائیں۔ ایسے موقعہ پر ایک آدھ نظم کا پڑھا جانا لازمی ہے۔"

"میں اس قدر جلدی کوئی چیز نہیں لکھ سکتا۔"

"میں نے بیکار اتنے آدمیوں سے آپ کا تعارف کرایا۔"

"بالکل بیکار!"

"ارے بھائی جان، کسی پرانے شاعر ہی کی کوئی چیز سنا دیجئے۔ یہاں کون جانتا ہے۔"

"جی نہیں، معاف فرمایئے۔ میں بھاٹ یا میراثی نہیں ہوں۔" یہ کہتے کہتے حضرتِ قمر وہاں سے چل دئے۔

گھر پہنچے، تو ان کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ سکینہ نے خوش ہو کر پوچھا۔

"اتنی جلدی کیونکر چلے آئے؟"

"میری وہاں ضرورت نہ تھی۔"

"چہرہ کھلا ہوا ہے۔ خوب عزت افزائی ہوئی ہوگی!"

"ایسی کہ خواب میں بھی امید نہ تھی۔"

"خوب خوش ہو رہے ہو؟"

"اس لئے، کہ آج مجھے ہمیشہ کے لئے سبق مل گیا۔ میں چراغ ہوں۔ اور جلنے کے لئے بنا ہوں۔ میں یہ بات بھول گیا تھا۔ مگر خدا نے مجھے زیادہ بھٹکنے نہ دیا۔ میرا یہ جھونپڑا ہی میرے لئے جنّت ہے۔ میں نے آج سمجھ لیا، کہ ادبی خدمت پوری عبادت ہے۔"

۲ دو بیل

جانوروں میں گدھا سب سے بیوقوف سمجھا جاتا ہے۔ جب ہم کسی شخص کو پرلے درجے کا احمق کہنا چاہتے ہیں۔ تو اُسے گدھا کہتے ہیں۔ گدھا واقعی بے وقوف ہے۔ یا اس کی سادہ لوحی اور انتہا درجہ کی قوّتِ برداشت نے اسے یہ خطاب دلوایا ہے۔ اس کا تصفیہ نہیں ہو سکتا۔ گائے شریف جانور ہے۔ مگر سینگ مارتی ہے۔ کتّا بھی غریب جانور ہے۔ لیکن کبھی کبھی اُسے غصّہ بھی آجاتا ہے۔ مگر گدھے کو کبھی غصّہ نہیں آتا جتنا جی چاہے مار لو۔ چاہے جیسی خراب، سڑی ہوئی گھاس سامنے ڈال دو۔ اس کے چہرے پر ناراضگی کے آثار کبھی نظر نہ آئیں گے۔ اپریل میں شاید کبھی کلیل کر لیتا ہو۔ پر ہم نے اسے کبھی خوش ہوتے نہیں دیکھا۔ اس کے چہرہ پر ایک مستقل مایوسی چھائی رہتی ہے۔ سکھ، دُکھ، نفع، نقصان سے کبھی اسے شاد ہوتے نہیں دیکھا۔ رِشی منیوں کی جس قدر خوبیاں ہیں۔ سب اس

میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ لیکن آدمی اُسے بے وقوف کہتا ہے۔ اعلیٰ خصلتوں کی ایسی توہین ہم نے اور کہیں نہیں دیکھی۔ ممکن ہے دُنیا میں سیدھے پن کے لئے جگہ نہ ہو۔

لیکن گدھے کا ایک بھائی اور بھی ہے۔ جو اس سے کچھ کم ہی گدھا ہے۔ اور وہ ہے بیل۔ جن معنوں میں ہم گدھے کا لفظ استعمال کرتے ہیں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں، جو بیل کو بے وقوفوں کا سردار کہنے کو تیار ہیں۔ مگر ہمارا خیال ایسا نہیں۔ بیل کبھی کبھی مارتا ہے۔ کبھی کبھی اڑیل بیل بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ اور کبھی کئی طریقوں سے وہ اپنی ناپسندیدگی اور ناراضگی کا اظہار کر دیتا ہے۔ لہٰذا اس کا درجہ گدھے سے نیچے ہے۔

جھوری کاچھی کے پاس دو بیل تھے۔ ایک کا نام ہیرا تھا۔ دوسرے کا موتی۔ دونوں پچھائیں نسل کے تھے۔ دیکھنے میں خوب صورت۔ کام میں چوکس۔ ڈیل ڈول میں اونچے۔ بہت دنوں سے ایک ساتھ رہتے رہتے دونوں میں محبت سی ہو گئی۔ دونوں آمنے سامنے یا ایک دوسرے کے پاس بیٹھے زبانِ خاموش میں ایک دوسرے سے بات چیت کیا کرتے تھے وہ ایک دوسرے کے دل کی بات کیوں کر سمجھ جاتے تھے۔ یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔ ضرور ان میں کوئی نہ کوئی ناقابلِ فہم قوت تھی۔ جس کے سمجھنے سے اشرف المخلوقات ہونے کا مدعی انسان محروم ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو چاٹ کر اور سونگھ کر اپنی محبت کا اظہار کرتے تھے۔ کبھی دونوں سینگ ملا لیا کرتے تھے۔ عناد سے نہیں۔ محض زندہ دلی سے محض ہنسی مذاق سے جیسے یار دوستوں میں کبھی کبھی دھول دھپا ہو جاتا

ہے۔ اس کے بغیر دوستی کچھ پھیکی اور ہلکی سی رہتی ہے جس پر زیادہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

جس وقت یہ دونوں بیل ہل یا گاڑی میں جوتے جاتے۔ اور گردنیں ہلا ہلا کر چلتے۔ تو ہر ایک کی یہی کوشش ہوتی تھی، کہ زیادہ بوجھ میری ہی گردن پر رہے۔ کام کے بعد دوپہر یا شام کو کھلتے، تو ایک دوسرے کو چوم چاٹ کر اپنی تکان اُتار لیتے۔ ناند میں کھلی بھوسا پڑ جانے کے بعد دونوں ایک ساتھ اُٹھتے۔ ایک ساتھ ناند میں منہ ڈالتے۔ اور ایک ہی ساتھ بیٹھتے۔ ایک منہ ہٹا لیتا۔ تو دوسرا بھی ہٹا لیتا تھا۔

ایک مرتبہ جھوری نے دونوں بیل چند دنوں کے لئے اپنے سسرال بھیجے۔ بیلوں کو کیا معلوم، وہ کیوں بھیجے جاتے ہیں۔ سمجھے مالک نے ہمیں بیچ دیا۔ کون جانے بیلوں کو اپنا بیچا جانا پسند آیا یا نہیں لیکن جھوری کے سالے کو انہیں اپنے گاؤں تک لے جانے میں دانتوں پسینہ آگیا۔ پیچھے سے ہانکتا، تو دونوں دائیں بائیں بھاگتے۔ آگے سے پکڑ کر کھینچتا۔ تو دونوں پیچھے کو زور لگاتے۔ مارتا، تو دونوں سینگ نیچے کر کے پھنکارتے۔ اگر ان بے زبانوں کی زبان ہوتی۔ تو جھوری سے پوچھتے۔ تم نے ہم غریبوں کو کیوں نکال دیا۔ ہم نے تمہاری خدمت کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ اگر اتنی محنت سے کام نہ چلتا تھا۔ تو اور کام لے لیتے۔ ہم کو انکار نہ تھا۔ ہمیں تمہاری خدمت میں مر جانا بھی قبول تھا۔ ہم نے کبھی دانے چارے کی شکایت نہیں کی۔ تم نے جو کچھ کھلایا۔ سر جھکا کر کھا لیا۔ پھر تم نے ہمیں اس ظالم کے ہاتھ کیوں بیچ دیا؟

شام کے وقت دونوں بیل گیا کے گاؤں میں جا پہنچے۔ دن بھر کے بھوکے تھے۔ لیکن جب ناند میں لگائے گئے۔ تو کسی نے بھی اس میں منہ نہ ڈالا۔ دونوں کا دل بھاری ہو رہا تھا۔ جسے انہوں نے اپنا گھر سمجھا تھا۔ وہ آج اُن سے چھوٹ گیا۔ یہ نیا گھر، نیا گاؤں، نئے آدمی، سب انہیں بیگانے لگتے تھے۔ دونوں نے چُپ کی زبان میں کچھ باتیں کیں۔ ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھا، اور لیٹ گئے۔

جب گاؤں میں سوتا پڑ گیا۔ تو دونوں نے زور مار کر پگھے تڑا لئے۔ اور گھر کی طرف چلے پگھے مضبوط تھے۔ کسی کو شبہ بھی نہ ہو سکتا تھا، کہ بیل انہیں توڑ سکیں گے۔ پر اُن دونوں میں اس وقت دُگنی طاقت آ گئی تھی۔ ایک جھٹکے میں رسّیاں ٹوٹ گئیں۔

جھوری نے صبح اُٹھ کر دیکھا۔ کہ دونوں بیل چرنی پر کھڑے تھے۔ دونوں کی گردنوں میں آدھا آدھا رسّہ لٹک رہا تھا۔ گھٹنوں تک پاؤں کیچڑ میں بھرے ہوئے تھے۔ اور دونوں کی آنکھوں میں محبّت اور ناراضگی جھلک رہی تھی۔ جھوری اُن کو دیکھ کر محبّت سے باؤلا ہو گیا۔ اور دوڑ کر ان کے گلے سے لپٹ گیا۔ انسان اور حیوان کی محبت کا یہ منظر نہایت دلکش تھا۔

گھر اور گاؤں کے لڑکے جمع ہو گئے۔ اور تالیاں بجا بجا کر اُن کا خیر مقدم کرنے لگے۔ گاؤں کی تاریخ میں یہ واقعہ اپنی قسم کا پہلا نہ تھا۔ مگر اہم ضرور تھا۔ بال سبھا نے فیصلہ کیا، کہ ان دونوں بہادروں کو ایڈریس دیا جائے۔ کوئی اپنے گھر سے روٹیاں لایا۔ کوئی گڑ۔ کوئی چوکر، کوئی بھوسی۔

ایک لڑکے نے کہا" ایسے بیل اور کسی کے پاس نہ ہوں گے"
دوسرے نے تائید کی " اتنی دور سے دونوں اکیلے چلے آئے"
تیسرا بولا " پچھلے جنم میں ضرور آدمی ہوں گے"
اس کی تردید کرنے کی کسی میں جرأت نہ تھی۔ سب نے کہا :۔
" ہاں بھائی، ضرور ہوں گے"
جھوری کی بیوی نے بیلوں کو دروازہ پر دیکھا۔ تو جل اٹھی۔ اور بولی :۔
" کیسے نمک حرام بیل ہیں۔ ایک دن بھی وہاں کام نہ کیا۔ اور بھاگ کھڑے ہوئے"
جھوری اپنے بیلوں پر یہ الزام برداشت نہ کر سکا۔ بولا" نمک حرام کیوں ہیں؟ چارہ دانہ نہ دیا ہوگا۔ کیا کرتے؟"
عورت نے تنگ آکر کہا " بس تم ہی بیلوں کو کھلانا جانتے ہو۔ اور تو سبھی پانی پلا پلا کر رکھتے ہیں"
جھوری نے چڑایا " چارہ ملتا، تو کیوں بھاگتے؟"
عورت چڑی۔" بھاگے اس لئے کہ وہ لوگ تم جیسے بدھوؤں کی طرح بیلوں کو سہلاتے نہیں۔ کھلاتے ہیں، تو توڑ کر جوتتے بھی ہیں۔ یہ دونوں ٹھہرے کام چور۔ بھاگ نکلے۔ اب دیکھتی ہوں، کہاں سے کھلی اور چوکر آتا ہے۔ خشک بھوسے کے سوا کچھ نہ دوں گی۔ کھائیں چاہے مریں"
وہی ہوا۔ مزدور کو تاکید کر دی گئی، کہ بیلوں کو صرف خشک بھوسا دیا جائے۔ بیلوں نے ناند میں منہ ڈالا۔ تو پھیکا پھیکا۔ نہ چکناہٹ۔ نہ رس۔ کیا کھائیں؟ پر امید نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

جھوری نے مزدور سے کہا " تھوڑی سی کھلی کیوں نہیں ڈال دیتا ہے بیٹا "

مزدور " مالکن مجھے مار ہی ڈالے گی "

جھوری " ڈال دے تھوڑی سی "

مزدور " نہ دادا۔ بعد میں تم بھی انہیں کی سی کہو گے "

۳

دوسرے دن جھوری کا سالا پھر آیا۔ اور بیلوں کو لے چلا۔ اب کے اس نے دونوں کو گاڑی میں جوتا۔ دو چار مرتبہ موتی نے گاڑی کو کھائی میں گرانا چاہا۔ مگر ہیرا نے سنبھال لیا۔ اس وقت دونوں میں قوتِ برداشت زیادہ تھی۔

شام کے وقت گھر پہنچ کر گیا نے دونوں کو موٹی رسیوں سے باندھا۔ اور کل کی شرارت کا مزہ چکھایا۔ پھر وہی خشک بھوسہ ڈال دیا۔ اپنے بیلوں کو کھلی چونی سب کچھ کھایا۔

ہیرا اور موتی اس برتاؤ کے عادی نہ تھے۔ جھوری انہیں پھول کی چھڑی سے بھی نہ مارتا تھا۔ اس کی آواز پر دونوں اڑنے لگتے تھے۔ یہاں مار پڑی۔ اس پر خشک بھوسہ۔ ناند کی طرف آنکھ بھی نہ اُٹھائی۔

دوسرے دن گیا نے بیلوں کو ہل میں جوتا۔ پر ان دونوں نے جیسے پاؤں اُٹھانے کی قسم کھا لی تھی۔ وہ مارتے مارتے تھک گیا۔ مگر انہوں نے قدم نہ اُٹھایا۔ ایک مرتبہ جب اس ظالم نے ہیرا کی ناک پر ڈنڈا جمایا۔ تو موتی غصے کے مارے آپے سے باہر ہو گیا۔ ہل لے بھاگا۔ ہل، رسی اور جوا جوت سب ٹوٹ کر برابر ہو گئے۔ گلے میں بڑی بڑی رسیاں نہ ہوتیں، تو

دونوں نکل گئے تھے۔

ہیرا نے زبان خاموش سے کہا۔ "بھاگنا مشکل ہے"۔

موتی نے بھی نگاہوں سے جواب دیا۔ "تمہاری تو اس نے جان سے لی تھی۔ اب کے بڑی مار پڑے گی"۔

ہیرا۔ "پڑنے دو۔ بیل کا جنم لیا ہے، تو مار سے کہاں بچیں گے"۔

گیا دو آدمیوں کے ساتھ دوڑا آرہا ہے۔ دونوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں ہیں۔

موتی۔ "کہو تو میں بھی دکھا دوں کچھ مزا؟"

ہیرا۔ "نہیں بھائی کھڑے ہو جاؤ"۔

موتی۔ "مجھے مارے گا، تو میں ایک آدھ کو گرا دوں گا"۔

ہیرا۔ "یہ ہمارا دھرم نہیں ہے"۔

موتی دل میں اینٹھ کر رہ گیا۔ اتنے میں گیا آپہونچا۔ اور دونوں کو پکڑ کر لے چلا۔

خیریت ہوئی، کہ اس نے اس وقت مار پیٹ نہ کی۔ نہیں تو موتی بھی تیار تھا۔ اس کے تیور دیکھ کر سہم گیا۔ اور اس کے ساتھی سمجھ گئے۔ کہ اس وقت ٹال جانا ہی مصلحت ہے۔

آج دونوں کے سامنے پھر وہی خشک بھوسا لایا گیا۔ دونوں چپ چاپ کھڑے رہے۔ گھر کے لوگ کھانا کھانے لگے۔ اسی وقت ایک چھوٹی سی لڑکی دو روٹیاں لئے نکلی۔ اور دونوں کے منہ میں دے کر چلی گئی۔ اس ایک ایک روٹی سے ان کی بھوک تو کیا مٹتی۔ مگر دونوں کے دل کو کھانا مل گیا۔ معلوم ہوا یہاں بھی کوئی صاحب دل رہتا ہے۔ یہ لڑکی گیا کی تھی۔ اس

کی ماں مرچکی تھی۔ سوتیلی ماں اُسے مارتی رہتی تھی۔ اس لئے ان بیلوں سے اسے ہمدردی تھی۔

دونوں دن بھر جوتے جاتے۔ اڑتے، ڈنڈے کھاتے، شام کو تھان پر باندھ دیے جاتے۔ اور رات کو وہی لڑکی انہیں ایک ایک روٹی دے جاتی۔ محبت کے اس کھانے کی یہ برکت تھی، کہ دو چار خشک بھوسے کے لقمے کھا کر بھی دونوں کمزور نہ ہوتے تھے۔ مگر دونوں کی آنکھوں کی نس نس میں سرکشی بھری تھی۔

ایک دن چپ کی زبان میں موتی نے کہا "اب تو نہیں سہا جاتا ہیرا"

ہیرا۔ "کیا کرنا چاہتے ہو؟"

موتی۔ "گیا کو سینگ پر اُٹھا کر پھینک دوں؟"

ہیرا۔ "مگر وہ لڑکی اسی کی بیٹی ہے۔ اسے مار کر گراؤ گے، تو وہ یتیم ہو جائے گی۔"

موتی۔ "تو مالکن کو پھینک دوں، وہ لڑکی کو ہر روز مارتی ہے۔"

ہیرا۔ "عورت کو مارو گے، بڑے بہادر ہو۔"

موتی۔ "تم کسی طرح نکلنے ہی نہیں دیتے۔ تو آؤ آج رسا تڑا کر بھاگ چلیں۔"

ہیرا۔ "ہاں یہ ٹھیک ہے۔ لیکن ایسی موٹی رسی ٹوٹے گی کیونکر؟"

موتی۔ "پہلے رسی کو چبالو۔ پھر جھٹکا دے کر تڑا لو۔"

رات کو جب لڑکی روٹیاں دے کر چلی گئی۔ دونوں رسیاں چبانے لگے۔ پر موٹی رسی منہ میں نہ آتی تھی۔ بچارے بار بار زور لگا کر رہ جاتے۔ معاً گھر کا دروازہ کھلا۔ اور وہی لڑکی نکلی۔ دونوں سر جھکا کر اس کے

ہاتھ چاٹنے لگے۔ دونوں کی دُمیں کھڑی ہوگئیں۔ اس نے ان کی پیشانی سہلائی اور بولی:۔

"کھول دیتی ہوں۔ بھاگ جاؤ۔ نہیں تو یہ لوگ تمہیں مار ڈالیں گے۔ آج گھر میں مشہور ہو رہا ہے، کہ تمہاری ناک میں ناتھ ڈال دی جائیں"

اس نے دونوں کے رستے کھول دیئے۔ پر دونوں چپ چاپ کھڑے رہے۔

موتی نے اپنی زبان میں پوچھا۔ "اب چلتے کیوں نہیں؟"

ہیرا نے جواب دیا۔ "اس غریب پر آفت آجائے گی۔ سب اسی پر شبہہ کریں گے"

یکایک لڑکی چلائی۔ "او دادا! او دادا! دونوں پھوپھا والے بیل بھاگے جا رہے ہیں۔ دوڑو۔ دونوں بیل بھاگے جا رہے ہیں"

گیا گھبرا کر باہر نکلا۔ اور بیلوں کو پکڑنے چلا۔ بیل بھاگے۔ گیا نے پیچھا کیا۔ وہ اور بھی تیز ہو گئے۔ گیا نے شور مچایا۔ پھر گاؤں کے کچھ اور آدمیوں کو ساتھ لانے کے لئے لوٹا۔ دونوں بیلوں کو بھاگنے کا موقعہ مل گیا۔ سیدھے دوڑتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ راستہ کا خیال نہ رہا۔ جس راہ سے یہاں آئے تھے۔ اس کا پتہ نہ تھا۔ نئے نئے گاؤں ملنے لگے۔ تب دونوں ایک کھیت کے کنارے کھڑے ہو کر سوچنے لگے۔ کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔

ہیرا نے اپنی زبان میں کہا: "معلوم ہوتا ہے۔ راستہ بھول گئے"

موتی: "تم بھی بے تحاشا بھاگے۔ وہیں اسے مار گراتے"

ہیرا: "اسے مار گراتے، تو دنیا کیا کہتی۔ وہ اپنا دھرم چھوڑ دے۔ لیکن

ہم اپنا دھرم کیونکر چھوڑ دیں؟"

دونوں بھوک سے بے حال ہو رہے تھے۔ کھیت میں مٹر کھڑی تھی۔ چرنے لگے۔ رہ رہ کر آہٹ لے رہے تھے۔ کہ کوئی آتو نہیں رہا۔ جب پیٹ بھر گیا۔ اور دونوں کو آزادی کا احساس ہوا۔ تو اچھلنے کودنے لگے۔ پہلے ڈکار لی۔ پھر سینگ ملائے۔ اور ایک دوسرے کو دھکیلنے لگے۔ موتی نے ہیرا کو کئی قدم پیچھے ہٹا دیا۔ یہاں تک کہ وہ ایک کھائی میں گر گیا۔ تب اُسے بھی غصہ آیا۔ سنبھل کر اُٹھا۔ اور پھر موتی سے لڑنے لگا۔ موتی نے دیکھا، کہ کھیل میں جھگڑا ہوا چاہتا ہے، تو ایک طرف ہٹ گیا۔

۳

ارے یہ کیا! کوئی سانڈ ڈونکتا چلا آتا ہے! ہاں سانڈ ہی تو ہے۔ وہ سامنے آپہنچا۔ دونوں دوست تذبذب میں پڑ گئے۔

سانڈ بھی پورا ہاتھی۔ اس سے لڑنا جان سے ہاتھ دھونا تھا۔ لیکن نہ لڑنے سے بھی جان بچتی نظر نہ آتی تھی۔ انہیں کی طرف آ رہا تھا۔ کتنا جسیم تھا!

موتی نے کہا۔ "بُرے پھنسے۔ جان کیسے بچے گی؟ کوئی طریقہ سوچو۔"

ہیرا نے کہا۔ "غرور سے اندھا ہو رہا ہے۔ منت سماجت کبھی نہ سُنے گا۔"

موتی۔ "بھاگ کیوں نہ چلیں؟"

ہیرا۔ "بھاگنا پست ہمتی ہے۔"

موتی۔ "تو تم یہیں مرو۔ بندہ تو دو گیارہ ہوتا ہے۔"

ہیرا۔ "اور جو دوڑ آئے، تو پھر؟"

موتی۔ "کوئی طریقہ بتاؤ۔ لیکن ذرا جلدی۔ وہ تو آپہنچا"۔

ہیرا۔ "طریقہ یہی ہے، کہ ہم دونوں ایک ساتھ حملہ کر دیں۔ میں آگے سے دھکیلوں۔ تم پیچھے سے دھکیلو۔ دیکھتے دیکھتے بھاگ کھڑا ہوگا۔ جونہی مجھ پر حملہ کرے۔ تم پیٹ میں سینگ چبھو دینا۔ جان جوکھوں کا کام ہے۔ لیکن دوسرا کوئی طریقہ نہیں"۔

دونوں دوست جان ہتھیلیوں پر لے کر آگے بڑھے۔ سانڈ کو کبھی منظم دشمن سے لڑنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ وہ انفرادی جنگ کا عادی تھا۔ جونہی ہیرا پر جھپٹا۔ موتی نے پیچھے سے ہلّہ بول دیا۔ سانڈ اس کی طرف مڑا تو ہیرا نے دھکیلنا شروع کیا۔ سانڈ چاہتا تھا، ایک ایک کر کے دونوں کو گرا لے۔ پر یہ بھی استاد تھے۔ اسے یہ موقعہ ہی نہ دیتے تھے۔ ایک مرتبہ سانڈ جھلّا کر ہیرا کو ہلاک کرنے چلا۔ تو موتی نے بغل سے آکر اس کے پیٹ میں سینگ رکھ دئے۔ بے چارہ زخمی ہو کر بھاگا۔ اور دونوں فتحیاب دوستوں نے دور تک اس کا تعاقب کیا۔ یہاں تک کہ سانڈ بے دم ہو کر گر پڑا۔ تب دونوں نے اس کا پیچھا چھوڑ دیا۔

دونوں بیل فتح کے نشہ میں جھومتے چلے جاتے تھے۔ موتی نے اپنے اشاروں کی زبان میں کہا "میرا جی تو چاہتا تھا، کہ بچّہ جی کو مار ہی ڈالوں"۔

ہیرا۔ "گرے ہوئے دشمن پر سینگ چلانا نامناسب ہے"۔

موتی۔ "یہ سب فضول ہے۔ اگر اس کا داؤ چلتا تو کبھی نہ چھوڑتا"۔

ہیرا۔ "اب کیسے گھر پہنچیں گے؟ یہ سوچو"۔

موتی۔ "پہلے کچھ کھالیں، تو سوچیں۔ ابھی تو عقل کام نہیں کرتی"۔

یہ کہہ کر موتی مٹر کے کھیت میں گھس گیا۔ ہیرا منع کرتا ہی رہ گیا۔ لیکن اس نے ایک نہ سُنی۔ ابھی دو ہی چار منہ مارے تھے۔ کہ دو آدمی لاٹھیاں لئے آ گئے۔ اور دونوں بیلوں کو گھیر لیا۔ ہیرا تو مینڈ پر تھا۔ نکل گیا۔ موتی کھیت میں تھا۔ اس کے کھُر کیچڑ میں دھنسنے لگے۔ نہ بھاگ سکا۔ پکڑا گیا۔ ہیرا نے دیکھا۔ دوست تکلیف میں ہے، تو لوٹ پڑا۔ پھنسیں گے، تو لے کھٹے۔ رکھوالوں نے اسے بھی پکڑ لیا۔ دوسرے دن دونوں دوست کانجی ہاؤس میں تھے۔

۴

ان کی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا، کہ سارا دن گذر گیا۔ اور کھانے کو ایک تنکا بھی نہ ملا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا، یہ کیسا مالک ہے۔ اس سے تو گیا ہی اچھا تھا۔ وہاں کئی بھینسیں تھیں، کئی بکریاں، کئی گھوڑے۔ کئی گدھے، مگر چارہ کسی کے سامنے بھی نہ تھا۔ سب زمین پر مُردے کی طرح پڑے تھے۔ کئی تو اس قدر کمزور ہو گئے تھے۔ کہ کھڑے بھی نہ ہو سکتے تھے۔ سارا دن دروازہ کی طرف دیکھتے رہے۔ مگر چارہ لے کر نہ آیا۔ تب غریبوں نے دیوار کی نمکین مٹی چاٹنی شروع کی۔ مگر اس سے کیا تسکین ہو سکتی تھی؟

جب رات کو بھی کھانا نہ ملا، تو ہیرا کے دل میں سرکشی کے خیالات پیدا ہوئے۔ موتی سے بولا "مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جان نکل رہی ہے"

موتی:- "اتنی جلدی ہمت نہ ہارو بھائی۔ یہاں سے بھاگنے کا طریقہ سوچو۔"

ہیرا:- "آؤ دیوار توڑ ڈالیں۔"

موتی:- "مجھ سے تو اب کچھ نہ ہو گا۔"

ہیرا:۔ "بس اسی بوتے پر اکڑتے تھے؟"

موتی:۔ "ساری اکڑ نکل گئی بھائی؟"

باڑے کی دیوار کچی تھی۔ ہیرا نے اپنے نوکیلے سینگ دیوار میں گاڑ دئے۔ اور زور مارا، تو مٹی کا ایک چپڑ نکل آیا۔ اس سے اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اس نے دوڑ دوڑ کر دیوار سے ٹکریں ماریں۔ ہر ٹکر میں تھوڑی تھوڑی مٹی گرنے لگی۔

اتنے میں کانجی ہاؤس کا چوکیدار لالٹین لے کر جانوروں کی حاضری لینے آنکلا۔ ہیرا کی وحشت دیکھ کر اس نے اسے کئی ڈنڈے رسید کئے۔ اور موٹی سی رسی سے باندھ دیا۔

موتی نے پڑے پڑے اس کی طرف دیکھا۔ گویا زبانِ حال سے کہا "آخر مار کھائی، کیا ملا؟"

ہیرا:۔ "زور تو آزمالیا"

موتی:۔ "ایسا زور مارنا کس کام کا۔ اور بندھن میں پڑ گئے"

ہیرا:۔ "اس سے باز نہ آؤں گا۔ خواہ بندھن بڑھتے جائیں"

موتی:۔ "جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے"

ہیرا:۔ "اس کی مجھے پروا نہیں۔ یوں بھی تو مرنا ہے۔ ذرا سوچو، اگر دیوار گر جاتی، تو کتنی جانیں بچ جاتیں۔ اتنے بھائی یہاں بند ہیں۔ کسی کے جسم میں جان ہی نہیں۔ دو چار دن یہی حال رہا۔ تو سب مر جائیں گے"

موتی نے بھی دیوار میں اسی جگہ سینگ مارا۔ تھوڑی سی مٹی گری۔ اور ہمت بڑھی۔ تو وہ دیوار میں سینگ لگا کر اسی طرح زور کرنے لگا۔ جیسے کسی سے لڑ رہا ہو۔ آخر کوئی دو گھنٹہ کی زور آزمائی کے بعد دیوار کا

کچھ حصّہ گر گیا۔ اس نے دوگنی طاقت سے دوسرا دھکّا لگایا۔ تو آدھی دیوار گر پڑی۔

دیوار کا گرنا تھا۔ کہ نیم جان جانور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ تینوں گھوڑیاں بھاگ نکلیں۔ بھیڑ بکریاں نکلیں۔ اس کے بعد بھینسیں بھی کھسک گئیں۔ پر گدھے ابھی کھڑے تھے۔

ہیرا نے پوچھا۔" تم کیوں نہیں جاتے؟"

ایک گدھے نے کہا۔" کہیں پھر پکڑ لیئے جائیں تو؟"

ہیرا۔" پکڑ لیئے جاؤ۔ پھر دیکھا جائے گا۔ اس وقت تو موقعہ ہے۔"

گدھا۔" ہمیں ڈر لگتا ہے۔ ہم نہ بھاگیں گے۔"

آدھی رات گذر چکی تھی۔ دونوں گدھے کھڑے سوچ رہے تھے۔ بھاگیں یا نہ بھاگیں؟ موتی اپنے دوست کی رسی کاٹنے میں مصروف تھا۔ جب وہ ہار گیا تو ہیرا نے کہا۔" تم جاؤ۔ مجھے یہیں رہنے دو۔ شاید کبھی ملاقات ہو جائے۔

موتی نے آنکھوں میں آنسو لا کر کہا۔" تم مجھے خود غرض سمجھتے ہو ہیرا۔ ہم اور تم اتنے دنوں ساتھ رہے ہے۔ آج تم مصیبت میں پھنسے۔ تو میں چھوڑ کر بھاگ جاؤں؟"

ہیرا۔" بہت مار پڑے گی۔ سمجھ جائیں گے یہ تمہاری شرارت ہے۔"

موتی۔" جس قصور کے لئے تمہارے گلے میں رسا پڑا ہے۔ اس کے لئے اگر مجھ پر مار پڑے گی۔ تو کیا بات ہے۔ اتنا تو ہو گیا، کہ نو دس جانوروں کی جان بچ گئی۔"

یہ کہہ کر موتی نے دونوں گدھوں کو سینگ مار مار کر باہر نکال دیا۔ اور اپنے دوست کے پاس آ کر سو گیا۔

صبح ہوتے ہوتے منشیوں، چوکیداروں اور دوسرے ملازموں میں کھلبلی مچ گئی۔ اس کے بعد موتی کی مرمت ہوئی۔ اور اسے بھی موٹی رسّی سے باندھ دیا گیا۔

۵

ایک ہفتہ تک دونوں بیل بندھے پڑے رہے۔ خدا جانے اس کانجی ہاؤس کے آدمی کیسے بے درد تھے، کہ کسی نے چارے کا ایک تنکا تک نہ ڈالا۔ ہاں ایک مرتبہ پانی دکھا دیا جاتا تھا۔ یہی ان کی خوراک تھی۔ دونوں اتنے کمزور ہو گئے، کہ اٹھا تک نہ جاتا تھا۔ ہڈیاں نکل آئیں۔

ایک دن باڑے کے سامنے ڈگڈگی بجنے لگی۔ اور دوپہر ہوتے ہوتے پچاس ساٹھ آدمی جمع ہو گئے۔ تب دونوں بیل نکالے گئے۔ اور ان کی دیکھ بھال ہونے لگی۔ لوگ آ آ کر اُن کی صورت دیکھتے۔ اور چلے جاتے تھے۔ ایسے نیم جان بیلوں کو کون خریدتا؟

مگر ایک آدمی جس کی آنکھیں سُرخ تھیں۔ اور جس کے چہرہ پر سخت دلی کے آثار نمایاں تھے۔ آیا۔ اور منشی جی سے باتیں کرنے لگا۔ اس کی شکل دیکھ کر کسی نامعلوم احساس سے دونوں بیل کانپ اُٹھے۔ وہ کون ہے۔ اور انہیں کیوں خریدتا ہے؟ اس کے متعلق انہیں کوئی شبہہ نہ رہا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اور سر جھکا لیا۔

ہیرا نے کہا۔ "گیا کے گھر سے ناحق بھاگے۔ اب جان نہ بچے گی"

موتی نے جواب دیا "کہتے ہیں۔ بھگوان سب پر مہربانی کرتے ہیں۔ انہیں ہماری حالت پر رحم کیوں نہیں آتا؟"

ہیرا۔ "بھگوان کے لئے ہمارا مرنا جینا دونوں برابر ہیں"

موتی:۔ "چلو اچھا ہے۔ کچھ دن ان کے پاس رہیں گے۔"

ہیرا:۔ "ایک مرتبہ بھگوان نے اس لڑکی کے روپ میں بچایا تھا۔ کیا اب نہ بچائیں گے؟"

موتی:۔ "یہ آدمی چھری چلائے گا۔ دیکھ لینا۔"

ہیرا:۔ "معمولی بات ہے۔ مر کر ان دکھوں سے چھوٹ جائیں گے۔"

نیلام ہو جانے کے بعد دونوں بیل اس آدمی کے ساتھ چلے۔ دونوں کی بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی۔ بیچارے پاؤں تک نہ اُٹھا سکتے تھے۔ مگر ڈر کے مارے چلے جاتے تھے۔ ذرا بھی آہستہ چلتے، تو وہ ڈنڈا جما دیتا تھا۔

راہ میں گائے بیلوں کا ایک ریوڑ مرغزار میں چرتا نظر آیا۔ سبھی جانور خوش تھے۔ کوئی اُچھلتا تھا۔ کوئی بیٹھا جگالی کرتا تھا۔ کیسی پُر مسرت زندگی تھی۔ لیکن وہ کیسے خود غرض تھے۔ کسی کو ان کی پرواہ تھی۔ کسی کو خیال نہ تھا، کہ ان کے دو بھائی موت کے پنجہ میں گرفتار ہیں۔

معاً انہیں ایسا معلوم ہوا، کہ یہ رستہ دیکھا ہوا ہے۔ ہاں ادھر ہی سے تو گیا اُن کو اپنے گاؤں لے گیا تھا۔ وہی کھیت ہیں۔ وہی باغ، وہی گاؤں۔ اب ان کی رفتار تیز ہونے لگی۔ ساری تکان، ساری کمزوری، ساری مایوسی رفع ہو گئی۔ ارے، یہ تو اپنا کھیت آ گیا۔ یہ اپنا کنواں ہے۔ جہاں ہر روز پانی پیا کرتے تھے۔

موتی نے کہا:۔ "ہمارا گھر نزدیک آ گیا۔"

ہیرا بولا:۔ "بھگوان کی مہربانی ہے۔"

موتی:۔ "میں تو اب گھر کو بھاگتا ہوں۔"

ہیرا:۔ "یہ جانے بھی دے گا۔ اتنا سوچ لو۔"

موتی:" اسے مار گراتا ہوں۔ جب تک سنبھلے، تب تک ہم گھر جا پہنچیں گے۔"

ہیرا:" نہیں، دوڑ کر تھان تک چلو۔ وہاں سے آگے نہ چلیں گے۔"

دونوں مست ہو کر بچھڑوں کی طرح کلیلیں کرتے ہوئے گھر کی طرف دوڑے۔ اور اپنے تھان پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ وہ آدمی بھی پیچھے پیچھے دوڑا آتا تھا۔

جھوری دروازہ پر بیٹھا دھوپ کھا رہا تھا۔ بیلوں کو دیکھتے ہی دوڑا۔ اور انہیں پیار کرنے لگا۔ بیلوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ایک جھوری کا ہاتھ چاٹ رہا تھا۔ دوسرا پَیر۔

اس آدمی نے آکر بیلوں کی رسّیاں پکڑ لیں۔ جھوری نے کہا" یہ بیل میرے ہیں۔"

"تمہارے کیسے ہیں۔ میں نے نیلام میں لئے ہیں۔"

جھوری:" میرا خیال ہے چُرا کر لائے ہو۔ چپکے سے چلے جاؤ۔ بیل میرے ہیں۔ میں بیچوں گا، تو بکیں گے، کسی کو میرے بیل بیچنے کا کیا حق ہے؟"

"میں نے تو خریدے ہیں۔"

"خریدے ہوں گے۔"

اس پر وہ آدمی زبردستی بیلوں کو لے جانے کے لئے آگے بڑھا۔ اسی وقت موتی نے سینگ چلایا۔ وہ آدمی پیچھے ہٹا۔ موتی نے تعاقب کیا۔ اور اُسے ریلتا ہوا گاؤں کے باہر تک لے گیا۔ اور تب اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ آدمی دور کھڑا دھمکیاں دیتا تھا۔ گالیاں دیتا تھا۔ پتھر پھینکتا تھا۔ اور موتی اس کا راستہ روکے ہوئے تھا۔ گاؤں کے لوگ یہ تماشا دیکھتے تھے۔ اور ہنستے تھے۔

جب وہ آدمی ہار کر چلا گیا۔ تو موتی اکڑتا ہوا لوٹ آیا۔

ہیرا نے کہا۔ "میں ڈر رہا تھا۔ کہ کہیں تم اسے مار نہ بیٹھو۔"

موتی:۔ "اگر نزدیک آتا، تو ضرور مارتا۔"

ہیرا:۔ "اب نہ آئے گا۔"

موتی:۔ "آئے گا تو دور ہی سے خبر لوں گا۔ دیکھو کیسے لے جاتا ہے۔"

ذرا دیر بعد ناند میں کھلی، بھوسہ۔ چوکر، دانہ سب کچھ بھر دیا گیا۔ دونوں بیل کھانے لگے۔ جھوری کھڑا ان کی طرف دیکھتا اور خوش ہوتا تھا۔ بیسوں لڑکے تماشا دیکھ رہے تھے۔ سارا گاؤں مسکراتا معلوم ہوتا تھا۔

اسی وقت مالکن نے آکر اپنے دونوں بیلوں کے ماتھے چوم لئے۔

جیل

آنند نے گدّے دار کرسی پر بیٹھ کر سگار جلاتے ہوئے کہا" آج وشوممبھر نے کیسی حماقت کی۔ امتحان قریب ہے۔ اور آپ آج والنٹیر بن بیٹھے۔ کہیں پکڑے گئے۔ تو امتحان سے ہاتھ دھو لیں گے۔ میرا تو خیال ہے۔ وظیفہ بھی بند ہو جائے گا۔"

سامنے دوسرے کوچ پر روپ متی بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اخبار کی طرف تھیں۔ مگر کان آنند کی طرف لگے ہوئے تھے۔ بولی۔" یہ تو بہت بُرا ہوا۔ تم نے سمجھایا نہیں؟"

آنند نے منہ بنا کر کہا۔" جب کوئی اپنے کو دوسرا گاندھی سمجھ لے، تو اسے سمجھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ اُلٹا مجھے سمجھانے لگتا ہے۔"

روپ متی نے اخبار لپیٹ کر زلفوں کو سنوارتے ہوئے کہا:" تم نے مجھے بھی تو نہیں بتایا۔ شاید میں اسے روک سکتی۔"

آنند نے کچھ چڑھ کر کہا "تو ابھی کیا بگڑا ہے - ابھی تو شاید کانگرس آفس ہی میں ہو گا - جا کر روک لو"

آنند اور وشومبھر دونوں ہی یونیورسٹی کے طالب علم تھے - آنند کے حصہ میں لکشمی بھی پڑی تھی سرسوتی بھی - وشومبھر پھوٹی تقدیر لے کر آیا تھا - پروفیسروں نے مہربانی کر کے ایک چھوٹا سا وظیفہ دے دیا تھا - بس یہی اس کے گذارے کی سبیل تھی - روپ متی بھی ایک سال قبل انہیں کی جماعت میں پڑھتی تھی - مگر اس سال اس کی صحت کچھ خراب ہو گئی تھی - اس لئے اس نے پڑھنا چھوڑ دیا تھا - دونوں نوجوان کبھی کبھی اس سے ملنے آتے رہتے تھے - آنند آتا تھا اس کا دل لینے کے لئے - وشومبھر آتا تھا، یوں ہی دل بہلانے کے لئے - طبیعت پڑھنے میں نہ لگتی - یا جی گھبراتا، تو یہاں آ بیٹھتا تھا - شاید اس سے اپنی مصیبت کی داستان کہہ کر اس کا دل سکون پا جاتا تھا - آنند کے سامنے کچھ اظہار درد کی اس میں ہمت نہ تھی - آنند کے پاس اس کے لئے ہمدردی کا ایک کلمۂ شیریں بھی نہ تھا - وہ اسے پھٹکارتا - ذلیل کرتا - اور بناتا تھا - وشومبھر میں اس سے بحث کرنے کی قابلیت نہ تھی - آفتاب کے روبرو چراغ کی ہستی ہی کیا؟ آنند اس کے دل و دماغ پر حاوی تھا - آج زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے اس دماغی غلبہ کو پرے پھینکا - اور اسی کی شکایت لے کر روپ متی کے پاس آیا تھا - مہینوں وشومبھر نے اپنے اندرونی خیالات کو آنند کے خیالات میں جذب کرنے کی سعی کی - لیکن دلائل کی دنیا میں شکست کھا کر بھی اس کا دل بغاوت کرتا رہا - بلاشبہہ اس کا ایک سال ضائع ہو جائے گا - ممکن ہے اس کی کالج کی زندگی کا سدا کے لئے خاتمہ ہو جائے - پھر ان چودہ پندرہ سالوں کی محنت پر پانی پھر جائے گا - نہ خدا ہی ملے گا، نہ وصال صنم نصیب ہو گا - آگ میں

کو دینے سے کیا حاصل ؟ یونیورسٹی میں رہ کر بھی تو بہت کچھ ملک کا کام کیا جا سکتا ہے ۔ آنند مہینے میں کچھ نہ کچھ چندہ جمع کر دیتا تھا ۔ کچھ طلبائ سے سودیشی کا عہد کرا لیتا تھا ۔ وشومبھر کو بھی آنند نے یہی مشورہ دیا ۔ اس کی دلیلوں نے وشومبھر کی عقل کو جیت لیا ۔ لیکن اس کے دل کو جیت نہ سکا ۔ آج جب آنند کالج گیا ۔ تو وشومبھر کا خط ملا ۔

" پیارے آنند

مجھے بخوبی علم ہے کہ میں جو کچھ کرنے والا ہوں ۔ وہ میرے لئے فائدہ بخش نہیں ۔ لیکن نہ جانے کون سی قوت مجھے کھینچے لئے جا رہی ہے ۔ میں جانا نہیں چاہتا ۔ لیکن جاتا ہوں ۔ جب وہ سبھی لوگ جن کی ہمارے دلوں میں عزت ہے ۔ اوکھلی میں سر ڈال چکے تو میرے لئے بھی اب کوئی دوسرا رستہ نہیں ہے ۔ میں اب اور اپنے دل کو دھوکا نہیں دے سکتا ۔ یونیورسٹی کی ڈگری اچھی شے ہے ۔ لیکن یہ میری عزت کا سوال ہے ۔ اور عزت کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کر سکتی ۔

تمہارا وشومبھر "

خط پڑھ کر آنند کے جی میں آیا ، کہ وشومبھر کو سمجھا بجھا کر لوٹا لائے ۔ مگر پھر اس کی حماقت پر غصہ آیا ۔ اور اسی طیش میں روپ متی کے پاس جا پہنچا ۔ اگر روپ متی اس کی خوشامد کر کے کہتی " جا کر اسے لوٹا لاؤ " تو شاید وہ چلا جاتا ۔ پر اس کا یہ کہنا ، کہ میں اسے روک لیتی ۔ اس کے لئے نا قابل برداشت تھا ۔ اس کے جواب میں ناراضی تھی بسرد مہری تھی ۔ اور شاید کسی قدر حسد بھی تھا ۔

روپ متی نے اولے غرور سے اس کی طرف دیکھا ۔ اور بولی " اچھی

بات ہے۔ میں چلی جاتی ہوں۔" پھر اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔" تم کیوں نہیں چلتے؟"

پھر وہی غلطی۔ اگر روپ متی اس کی خوشامد کر کے کہتی، تو آنند ضرور اس کے ساتھ چلا جاتا۔ لیکن اس کے سوال میں پہلے ہی یہ اندیشہ چھپا تھا، کہ آنند جانا نہیں چاہتا۔ مغرور آنند اس طرح نہیں جا سکتا۔ اس نے اُداس ہو کر جواب دیا۔

"میرا جانا لاحاصل ہے۔ تمہاری باتوں کا زیادہ اثر ہوگا۔ وہ میری میز پر یہ خط چھوڑ گیا تھا۔ جب وہ روح اور فرض اور معراج کی بڑی بڑی باتیں سوچ رہا ہے۔ اور اپنے آپ کو آسمان کا باشندہ تصور کرتا ہے۔ تو میرا اس پر کوئی اثر نہ ہوگا۔"

اس نے جیب سے خط نکال کر روپ متی کے سامنے رکھ دیا۔ ان الفاظ میں جو اشارہ اور طعن تھا۔ اس نے ایک لمحہ تک روپ متی کو اس کی طرف دیکھنے نہ دیا۔ آنند کے اس ظالمانہ حملہ نے اسے جیسے ہلاک کر دیا۔ پھر ایک ہی لمحہ میں سرکشی کی ایک چنگاری سی اس کے اندر جا گھسی۔ اس نے نہایت سکون سے خط کھول کر پڑھا۔ پڑھا صرف آنند کے حملہ کا جواب دینے کے لئے۔ لیکن پڑھتے پڑھتے اس کا چہرہ جیسے چمکنے لگ گیا۔ گردن تن گئی۔ آنکھوں میں ایثار کی سُرخی آ گئی۔

اس نے خط کو میز پر رکھ دیا۔ اور بولی "نہیں، اب میرا جانا بھی بیکار ہے۔"

آنند نے اپنی جیت پر خوش ہو کر کہا۔" میں نے تو تم سے پہلے ہی کہہ دیا ہے، کہ اس وقت اس کے سر پر بھوت سوار ہے۔ اس پر کسی کے سمجھانے کا اثر نہ ہوگا جب سال بھر جیل میں چکی پیس لے گا۔ اور وہاں سے تپ دق لے کر نکلے گا۔ یا پولیس کے ڈنڈے سے سر اور ہاتھ پاؤں تڑوا لے گا، تو عقل ٹھکانے

آئے گی - ابھی تو بچے اور تالیوں کے خواب دیکھ رہا ہوگا۔"

روپ متی سامنے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی - اسے نیلے آسمان میں بادل کی ایک تصویر سی نظر آئی - کمزور، دبلی، پتلی، برہنہ جسم، گھٹنوں تک دھوتی چکنا سر - پوپلا منہ، عبادت، ایثار اور صداقت کی زندہ مورت -

آنند نے پھر کہا۔" اگر مجھے یقین ہو کہ میرے خون سے ملک بیدار ہو جائے گا، تو میں اپنا خون دینے کو آج تیار ہوں - لیکن میرے جیسے سو پچاس آدمی نکل آئے، تو کیا ہوگا - جان دے دینے کے علاوہ اور تو کچھ نتیجہ نظر نہیں آتا۔"

روپ متی اب بھی وہی بادل کی تصویر دیکھ رہی تھی - اس کا وہ تبسم - وہ سادہ دلفریب مسکراہٹ جس نے کائنات کو جیت لیا ہے - آنند پھر بولا -

"جن حضرات کو امتحان کا بھوت ستایا کرتا ہے - انہیں خدمت وطن کی سوجھتی ہے - کوئی پوچھے، آپ اپنی خدمت تو کر نہیں سکتے - وطن کی کیا خدمت کریں گے - اُدھر کے ڈنڈے بھی ہیں۔"

روپ متی کی آنکھیں اب بھی آسمان کی طرف لگی ہوئی تھیں - آنند نے جیسے چونک کر کہا۔" ہاں بڑا پُر لطف فلم ہے - چلتی ہو، پہلے شو میں دیکھ آئیں۔"

روپ متی نے گویا آسمان سے اُتر کر جواب دیا۔" نہیں، میرا جی نہیں چاہتا۔"

آنند نے آہستہ سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔" کیوں طبیعت تو اچھی ہے؟"

روپ متی نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہ کی - بولی۔" ہاں طبیعت کو کیا ہوا ہے۔"

آنند۔" تو چلتی کیوں نہیں؟"

روپ متی۔" آج جی نہیں چاہتا۔"

آنند۔" تو پھر میں بھی نہ جاؤں گا۔"

روپ متی :۔ "نہایت نیک خیال ہے۔ ٹکٹ کے دام کسی کارِ خیر میں دے دو۔"

آنند :۔ "یہ تو ٹیڑھی شرط ہے۔ مگر منظور!"

روپ متی :۔ "کل رسید مجھے دکھا دینا۔"

آنند :۔ "تمہیں مجھ پر اتنا بھی اعتبار نہیں؟"

وہ کچھ بیدل ہو کر ہوسٹل چلا گیا۔ ذرا دیر بعد روپ متی سوراج بھون کی طرف چلی۔

۲

روپ متی سوراج بھون پہنچی۔ تو والنٹیروں کی ایک جماعت بدیشی کپڑوں کے گوداموں پر دھرنا دینے جا رہی تھی۔ وشومبھر اس جماعت میں نہ تھا۔ دوسری جماعت شراب کی دکانوں پر جانے کو تیار تھی۔ وشومبھر اس میں بھی نہ تھا۔ روپ متی نے سکریٹری کے پاس جا کر پوچھا۔ "آپ بتا سکتے ہیں وشومبھر کہاں ہیں؟"

سکریٹری :۔ "کون وشومبھر؟ وہی جو آج ہی بھرتی ہوئے ہیں؟"

روپ متی :۔ "جی ہاں وہی۔"

سکریٹری :۔ "بڑا دلیر آدمی ہے۔ اس نے دیہات میں کام کرنے کا ذمہ لیا ہے۔ اسٹیشن پر پہنچ چکا ہوگا۔ سات بجے کی گاڑی سے جا رہا ہے۔"

روپ متی :۔ "تو ابھی سٹیشن پر ہوں گے؟"

سکریٹری نے گھڑی پر نظر ڈال کر جواب دیا۔ "ہاں شاید ابھی سٹیشن پر مل جائیں۔"

روپ متی نے باہر نکل کر سائیکل تیز کی۔ سٹیشن پر پہنچی، تو دیکھا وشومبھر

پلیٹ فارم پر کھڑا ہے۔ روپ متی کو دیکھتے ہی اس کے پاس چلا آیا۔ اور بولا۔
"تم یہاں کیسے آگئیں؟ آج آنند سے ملاقات ہوئی یا نہیں؟"
روپ متی نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھ کر کہا۔" یہ تم نے کیا صورت بنا لی ہے۔ کیا پاؤں میں جوتا پہننا بھی حبِ وطن کے خلاف ہے؟"
وشومبھر نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔" آنند بابو نے تم سے کچھ کہا تو نہیں؟"
روپ متی نے جواب دیا۔" جی ہاں کہا ہے۔ لیکن تمہیں یہ کیا سوجھی؟ دو سال سے کم کے لئے نہ جاؤ گے۔ اتنا سوچ لو۔"
وشومبھر کا منہ اُتر گیا۔ بولا۔" جب یہ جانتی ہو، تو کیا تمہارے پاس میری ہمت بڑھانے کو دو لفظ بھی نہیں ہیں؟"
روپ متی کا دل مسوس اُٹھا۔ مگر اس نے ظاہر نہ کیا۔ بولی۔" تم مجھے دشمن سمجھتے ہو، یا دوست؟"
وشومبھر نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔" تم ایسا سوال کیوں پوچھتی ہو روپ متی؟ اس کا جواب میرے منہ سے سُنے بغیر بھی تم کہہ سکتی ہو، کہ میرا جواب کیا ہو گا۔"
روپ متی:" تو میرا مشورہ یہ ہے کہ مت جاؤ۔ اب بھی لوٹ چلو۔"
وشومبھر:" یہ دوست کا مشورہ نہیں ہے روپ متی، مجھے یقین ہے، یہ بات تم دل سے نہیں کہہ رہی ہو۔ ذرا سوچو۔ میری جان کی قیمت کیا ہے؟ ایم، اے پاس کرنے کے بعد بھی سو روپے کی ملازمت! بہت بڑھا، تو تین چار سو تک پہنچ جاؤں گا۔ اس کے بدلے یہاں کیا ملے گا؟ جانتی ہو سارے ملک کے لئے سوراج! اتنے عظیم الشان مقصد کے لئے مر جانا بھی اس زندگی سے کہیں اچھا ہے۔ اب جاؤ۔ گاڑی آ رہی ہے۔ آنند بابو سے کہنا۔ مجھ

سے ناراض نہ ہوں "

روپ متی نے آج تک اس کُند ذہن نوجوان پر رحم کیا تھا۔ اس وقت اسے اس سے عقیدت ہو چلی تھی۔ ایثار میں دل کو کھینچنے کی جو طاقت ہے۔ روپ متی کو اس نے زور سے کھینچا۔ پھر ناموافق حالات کا تفاوت مٹ سا گیا۔ وشومبھر میں جس قدر خامیاں تھیں۔ وہ سب خوبیاں بن کر چمک اُٹھیں۔ اس کے دل کی وسعتوں میں وہ کسی پنچھی کی مانند اُڑ اُڑ کر گوشۂ عافیت تلاش کرنے لگیں "

روپ متی نے اس کی طرف عقیدت مندانہ انداز سے دیکھ کر کہا "مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو "

وشومبھر کو جیسے گھڑوں نشہ چڑھ گیا۔ بولا۔ " تم کو !؟ آنند بابو مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے "

روپ متی " میں آنند بابو کے ہاتھوں بکی نہیں ہوں "

وشومبھر " آنند تو تمہارے ہاتھوں بکے ہوئے ہیں "

روپ متی نے سرکش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ پر کچھ بولی نہیں۔ ماحول اسے اس وقت پاؤں کی بیڑیاں معلوم ہو رہا تھا۔ کاش، وہ بھی وشومبھر کی مانند آزاد ہوتی۔ امیر والدین کی اکلوتی لڑکی۔ ناز و نعمت میں پلی ہوئی اس وقت اپنے آپ کو مقید سمجھ رہی تھی۔ اس کی رُوح ان بندشوں کو توڑنے کے لئے پھڑپھڑانے لگی۔

گاڑی آ گئی۔ مسافر اُترنے لگے۔ روپ متی نے آبدیدہ ہو کر کہا " تم مجھے نہیں لے چلو گے ؟"

وشومبھر نے مستقل مزاجی سے جواب دیا " نہیں "

روپ متی " کیوں ؟ "

وشومبھر:۔ "میں اس کا جواب دینا نہیں چاہتا۔"

روپ متی:۔ "کیا تم سمجھتے ہو، کہ میں دیہات میں نہ رہ سکوں گی؟"

وشومبھر نادم ہو گیا۔ یہ بھی ایک بڑا سبب تھا۔ مگر اس نے انکار کر دیا۔ "نہیں یہ بات تو نہیں ہے روپ متی۔"

روپ متی:۔ "تو پھر کیا بات ہے؟ کیا اندیشہ ہے کہ والد صاحب مجھے گھر سے نکال دیں گے؟"

وشومبھر:۔ "اگر یہ اندیشہ ہو، تو کیا یہ کم ہے؟"

روپ متی:۔ "میں اس کی ذرا پروا نہیں کرتی۔ ایک تنکے برابر بھی نہیں۔"

وشومبھر نے دیکھا۔ روپ متی کے چاند سے چہرے پر آہنی ارادہ کی روشنی چمک رہی ہے۔ وہ اس کے اس ارادے کے سامنے کانپ اُٹھا۔ بولا:۔ "میری درخواست قبول کر لو۔ روپ متی۔ میں تم سے یہ منّت کرتا ہوں۔"

روپ متی سوچنے لگی۔

وشومبھر نے کہا:۔ "میری خاطر تمہیں یہ ارادہ ترک کر دینا ہوگا۔"

روپ متی سر جھکا کر بولی:۔ "اگر یہ تمہارا حکم ہے۔ تو میں اس کی تعمیل کروں گی۔ وشومبھر تم شاید دل میں سمجھتے ہوگے۔ یہ عارضی جوش میں آ کر اس وقت مستقبل کو غارت کرنے جا رہی ہے۔ میں ثابت کر دوں گی۔ یہ میرا عارضی جوش نہیں۔ بلکہ مصیبتوں میں بھی قائم رہنے والا عزم ہے۔ جاؤ، مگر میری ایک بات یاد رکھنا۔ قانون کے پنجہ میں اسی وقت آنا۔ جب تمہاری اصول پرستی پر حرف آتا ہو۔ میں تمہاری کامیابی کے لئے پرارتھنا کرتی رہوں گی۔"

گارڈ نے سیٹی دی۔ وشومبھر اندر جا بیٹھا۔ گاڑی چلی گئی۔ روپ متی

گویا کائنات کی دولت آنچل میں لئے کھڑی رہی۔

۳

روپ متی کے پاس وشو مبھر کا ایک پرانا بوسیدہ سا فوٹو المار ی کے ایک کونے میں پڑا تھا۔ آج اسٹیشن سے لوٹ کر اس نے اُسے نکالا۔ اور اسے ایک خوب صورت فریم میں لگا کر میز پر رکھ دیا۔ آنند کا فوٹو وہاں سے ہٹا دیا گیا۔

وشو مبھر نے تعطیلوں میں اُسے دو چار خط لکھے تھے۔ روپ متی نے انہیں پڑھ کر ایک طرف پھینک دیا تھا۔ آج اس نے ان خطوں کو نکالا۔ اور انہیں دوبارہ پڑھا۔ ان خطوں میں آج حلاوت تھی۔ روپ متی نے انہیں نہایت حفاظت سے رائیٹنگ بکس میں بند کر دیا۔

دوسرے دن اخبار آیا، تو روپ متی اس پر ٹوٹ پڑی۔ وشو مبھر کا نام دیکھ کر وہ مسرت سے پھول اُٹھی۔ دن میں ایک مرتبہ سوراج بھون میں جانا اس کا معمول ہو گیا۔ جلسوں میں برابر شریک ہوتی۔ عیش و آرام کی تمام اشیاء ایک ایک کر کے پھینک دیں۔ ریشمی ساڑھیوں کی جگہ گاڑھے کی ساڑھیاں آئیں۔ چرخہ بھی آیا۔ وہ گھنٹوں بیٹھی سوت کاتا کرتی۔ اس کا سوت روز بروز باریک ہوتا جاتا تھا۔ اسی سوت سے وہ وشو مبھر کے کُرتے بنائے گی۔

اسی زمانہ میں امتحان کی تیاریاں تھیں۔ آنند کو پھر اس سے ملنے کی فرصت نہ ملی۔ دو ایک مرتبہ وہ آیا۔ لیکن زیادہ دیر بیٹھا نہیں۔ شاید روپ متی کی سرد مہری نے اسے نہ بیٹھنے دیا ہو۔

ایک مہینہ بیت گیا۔

ایک دن شام کو آنند آیا۔ روپ متی سوراج بھون جانے کو تیار تھی۔

آنند نے بھویں سکوڑ کر کہا: "تم سے تو اب بات کرنا بھی مشکل ہے۔"

روپ متی نے کرسی پر بیٹھ کر جواب دیا: "تمہیں بھی تو کتابوں سے چھٹی نہیں ملتی۔ آج کی تازہ خبر نہیں ملی۔ سوراج بھون میں روز بروز کی خبریں مل جاتی ہیں۔"

آنند نے فلاسفروں کی سی افسردگی سے کہا: "وشومبھر نے تو سُنا ہے۔ دیہات میں خوب شور و غل مچا رکھا ہے۔ جو کام اس کے لائق تھا۔ اسے مل گیا۔ یہاں اس کی زبان نہ کھلتی تھی۔ وہاں دیہات میں خوب گرجتا ہوگا۔ آدمی منچلا ہے۔"

روپ متی نے اس کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا۔ جو کہہ رہی تھیں، تم کو یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔ اور بولی۔ "آدمی میں اگر یہ خوبی ہے، تو دوسرے سارے عیب مٹ جاتے ہیں۔ قومی خبریں پڑھنے کو کب فرصت ملتی ہوگی۔ وشومبھر نے گاؤں میں ایسی بیداری پیدا کر دی ہے کہ بدیشی کپڑے کا ایک تار بھی نہیں بکنے پاتا۔ نہ کوئی نشہ کی دکانوں پر جاتا ہے۔ اور مزہ یہ ہے کہ پکٹنگ کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اب قومی پنچایتیں کھول رہے ہیں۔"

آنند نے بے پروائی سے کہا: "تو سمجھ لو۔ اب اس کے چلنے کے دن بھی آ گئے۔"

روپ متی نے جوش سے جواب دیا: "اتنا کام کر کے جانا بہت سستا نہیں۔ کل تو وہاں ایک بڑا جلسہ ہونے والا تھا۔ پرگنہ بھر کے لوگ جمع ہوئے ہوں گے۔ سُنا ہے۔ آج کل دیہات سے کوئی مقدمہ نہیں آتا۔ وکیلوں کی نانی مری جا رہی ہے۔"

آنند نے قدرے جوش سے کہا: "یہی تو سوراج کا مزہ ہے کہ زمیندار، وکیل

اور بیوپاری سب مریں - صرف مزدور اور کسان رہ جائیں "۔

روپ متی نے سمجھ لیا - آج آنند تل کر آیا ہے - اس نے بھی جیسے آستین چڑھاتے ہوئے کہا۔ "تو کیا چاہتے ہو کہ زمیندار اور وکیل اور بیوپاری غریبوں کا خون چوس چوس کر موٹے ہوتے چلے جائیں - اور کوئی زبان نہ کھولے؟"

آنند گرم ہو کر بولا - "علم اور دولت کی حکمرانی ہمیشہ رہی ہے - اور ہمیشہ رہے گی - ہاں اس کی صورت بدل سکتی ہے "۔

روپ متی نے جوش سے کہا "اگر سوراج ملنے پر بھی دولت کو ہی جگہ ملے، اور تعلیم یافتہ لوگ سوسائیٹی میں اسی طرح غرض کے اندھے بنے رہیں - تو سوراج نہ ملنا اچھا - امراء کے تموّل اور تعلیم یافتہ طبقہ کی خود غرضیوں نے ہمیں پیس ڈالا - جن برائیوں کو رفع کرنے کے لئے آج ہم جان کو ہتھیلی پر لئے ہیں - انہی برائیوں کو کیا ہم اس لئے سر پر چڑھا لیں گے کہ وہ بدیسی نہیں، سودیشی ہیں - کم از کم میرے لئے تو سوراج کا یہ مطلب نہیں، کہ جان کی جگہ گوبند آ بیٹھے - میں سوسائیٹی کی ایسی حالت دیکھنا چاہتی ہوں - جہاں غریب سے غریب آدمی کو بھی پیٹ بھر کر کھانا میسّر آ سکے "۔

آنند "یہ تمہاری ذاتی رائے ہو گی "۔

روپ متی "تم نے ابھی اس تحریک کا لٹریچر پڑھا ہی نہیں ہے "۔

آنند - "نہ پڑھا ہے، نہ پڑھنا چاہتا ہوں "۔

روپ متی "نہ پڑھو - اس سے ملک کو کوئی نقصان پہنچنے کا احتمال نہیں ہے "۔

آنند - "تم تو جیسے وہ رہی نہیں - بالکل کایا پلٹ ہو گئی "۔

اتنے میں چٹھی رساں نے اخبار لا کر میز پر رکھ دیا - روپ متی نے

بے صبری سے اسے کھولا۔ پہلے عنوان پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں جیسے سرور چھا گیا۔ گردن خود بخود تن گئی۔ اور چہرے پر ایک عجیب قسم کا نور برسنے لگا۔

اس نے جوش سے کھڑے ہو کر کہا: "وشومبھر گرفتار ہو کر دو سال کے لئے جیل چلے گئے"۔

آنند نے افسردگی سے پوچھا: "کس معاملہ میں؟"

روپ متی نے وشومبھر کے فوٹو کی طرف تاکتے ہوئے کہا: "رانی گنج میں جلسہ تھا۔ وہیں پکڑے گئے ہیں"۔

آنند: "میں نے تو پہلے ہی کہا تھا، کہ دو سال کے لئے جائیں گے۔ زندگی خراب کر لی"۔

روپ متی نے سرد مہری سے کہا: "کیا ڈگری لے لینے سے ہی آدمی کی زندگی شاندار بنتی ہے؟ کیا سارا علم، سارا تجربہ کتابوں ہی میں بھرا ہے؟ میرا خیال ہے انسانی فطرت کا جس قدر عملی تجربہ وشومبھر کو دو سال میں ہو جائے گا۔ اتنا تجربہ فلسفہ اور منطق کی کتابوں سے تمہیں دس سال میں بھی نہ ہوگا۔ اگر تعلیم کا مقصد کیرکٹر ہے۔ تو ملکی تحریک میں اس کے جس قدر ذرائع ہیں، وہ پیٹ کی لڑائی میں کبھی نہیں ہو سکتے۔ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ ہمارے لئے پیٹ کی فکر ہی بہت ہے۔ تو میں مان لوں گی، لیکن ملک اور قوم کی خدمت کرنے والوں کو بے وقوف بنانا میرے لئے ناقابل برداشت ہے"۔

آنند: "آج وشومبھر کو مبارکباد دینے کے لئے جلسہ ہوگا۔ جاؤ گی؟"

روپ متی نے خود سرانہ انداز میں کہا: "ضرور جاؤں گی۔ میں تو لیکچر بھی دوں گی۔ کل رانی گنج چلی جاؤں گی۔ اور وشومبھر نے جو چراغ روشن کیا ہے۔

میری زندگی میں بھٹکنے نہ پائے گا"

آنند نے ڈوبتے ہوئے آدمی کی طرح تنکے کا سہارا لے کر کہا "تم نے اپنے والدین سے بھی پوچھا؟"

روپ متی: "پوچھ لوں گی"

آنند: "اور وہ تمہیں اجازت دے دیں گے؟"

روپ متی: "اصول کے سامنے کسی کی اجازت کی ضرورت ہی نہیں پڑتی"

آنند: "اچھا، یہ نئی بات معلوم ہوئی"

یہ کہتا ہوا آنند اٹھ کھڑا ہوا۔ اور بغیر کچھ کہے کمرہ سے باہر نکل گیا۔ اس وقت اس کے پیر اس طرح لڑکھڑا رہے تھے جیسے اب گرا۔ اب گرا......

شکار

پھٹے پُرانے کپڑوں والی مُنیا نے رانی دسودھا کے چاند سے مُکھڑے کی طرف دیکھا۔ اور راج کمار کو گود میں لیتے ہوئے کہا۔ "ہم غریبوں کا اس طرح کیسے گذارہ ہو سکتا ہے۔ مہارانی، میری تو اپنے آدمی سے ایک دن نہ پٹے۔ میں اسے گھر میں نہ گھُسنے دوں۔ ایسی کھری کھری سُناؤں، کہ اُسے چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔"

رانی دسودھا نے سنجیدگی سے مسکرا کر کہا۔ "کیوں وہ کہے گا، تو میری باتوں میں بولنے والی کون ہے؟ میں جو چاہوں کروں۔ تو اپنا روٹی کپڑا لیتی جا۔ تجھے میری دوسری باتوں سے کیا غرض؟ میں تیرا غلام نہیں ہوں۔"

منیا، تین ہی دن ہوئے۔ یہاں لڑکوں کو کھلانے کے لئے نوکر ہوئی تھی اس سے قبل دو چار بھلے گھروں میں کھانا پکانے پر نوکر رہ چکی تھی۔ مگر رانیوں سے بات چیت کرنے کا سلیقہ اسے ابھی تک نہ آیا تھا۔ اس کا سوکھا ہوا

چہرہ جوش سے تمتما اُٹھا - بلند آواز سے بولی :" جس دن ایسی باتیں منہ سے نکالے گا - مونچھیں اُکھاڑ لوں گی سرکار - وہ میرا غلام نہیں ہے، تو کیا - میں ہی اس کی لونڈی ہوں ؟ میں خود نہیں کھاتی، اسے کھلا دیتی ہوں - کیونکہ وہ مرد بچہ ہے - پلے داری میں اسے مشقت کرنی پڑتی ہے - خود پھٹے پُرانے کپڑے پہنتی ہوں - لیکن اسے میلا کپڑا نہیں پہننے دیتی - جب میں اس کے لئے اتنا کرتی ہوں، تو اس کی کیا مجال ہے کہ مجھے آنکھیں دکھا جائے - اپنے گھر کو آدمی اس لئے چھاتا پوتتا ہے - کہ اس سے برکھا رت کے وقت بچاؤ ہو - اگر یہ اندیشہ لگا رہے کہ گھر جانے کب گر پڑے گا - تو ایسے گھر میں کون رہیگا ؟ اس سے تو روکھ تلے جا بیٹھنا کہیں اچھا - کل جانے کہاں بیٹھا گاتا بجاتا رہا - دس بجے رات کو لوٹا - میں رات بھر اس سے بولی ہی نہیں - لگا پیروں پڑنے گھگھیانے، تب میرا دل پسیج گیا - یہی مجھ میں عیب ہے - مجھ سے اس کا غمگین چہرہ نہیں دیکھا جاتا - اسی لئے وہ کبھی کبھی شیر ہو جاتا ہے - لیکن اب میں بھی پکی ہو گئی ہوں - پھر کسی دن بگاڑ کیا، تو یاد ہی کرے گا - یا وہ ہی رہے گا - یا میں ہی رہوں گی - جو بیٹھ کر کھائے - وہ دھونس سہے - یہاں برابر کی کمائی کرتی ہوں "

دسودھا نے اسی انداز سے پھر پوچھا " اگر وہ تجھے بٹھا کر کھلاتا - تب تو اس کی دھونس سہتی ؟"

منیا جیسے لڑنے پر آمادہ ہو گئی - بولی :" بٹھا کر کوئی کیا کھلائے گا سرکار - مرد باہر کام کرتا ہے، تو ہم بھی گھر میں کام کرتے ہیں - کیا گھر کے کام میں محنت نہیں کرنی پڑتی - باہر کے کام سے تو رات کو چھٹی مل جاتی ہے - گھر کے کام سے تو رات کو بھی چھٹی نہیں ملتی - مرد یہ چاہے، کہ مجھے گھر میں

بٹھا کر آپ سیر سپاٹے کرتا پھرے۔ تو مجھ سے تو نہ برداشت ہوگا"

یہ کہتے ہوئے منیا ناچکمار کو سنتے ہوئے باہر چلی گئی۔ دسودھا نے تھکی ہوئی آنکھوں سے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ باہر ہرا بھرا باغ تھا۔ جس کے رنگا رنگ پھول اپنی چند روزہ بہار کا جوبن دکھا رہے تھے۔ اور پیچھے ایک عالی شان مندر آسمان میں اپنا سنہرا سر اُٹھائے سورج سے آنکھیں ملا رہا تھا۔ عورتیں رنگ برنگ کے کپڑے پہنے پوجا کرنے آرہی تھیں۔ مندر کے دائیں طرف تالاب میں کنول صبح کے سرور میں مسکرا رہے تھے۔ لیکن قدرت کی اس دل آویزی میں بھی یہ طاقت نہ تھی، کہ دسودھا کی طبیعت کو ہرا کر دیتی۔ اس تالاب کے کنارے ملاح کا ایک ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا بنا ہوا تھا۔ دسودھا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ باغ و بہار کے درمیان کھڑا وہ سونا جھونپڑا اس کے عیش و عشرت سے گھرے ہوئے دل کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔ اس کے جی میں آیا، جا کر جھونپڑے کے گلے لپٹ جاؤں، اور خوب روؤں۔

دسودھا کو یہاں آئے پانچ سال گذر گئے تھے پہلے وہ اپنی خوش نصیبی پر پھولی نہ سماتی تھی۔ ماں باپ کے چھوٹے سے کچے گھر کو چھوڑ کر وہ اس محل میں آگئی تھی۔ جہاں دولت اس کے پیر چومتی تھی۔ اس وقت دولت ہی اس کی آنکھوں میں سب کچھ تھی۔ شوہر کی محبت دوسرے درجہ پر تھی۔ لیکن اس کا حریص دل دولت پر مطمئن نہ رہ سکا۔ شوہر کی محبت کے لئے ہاتھ پھیلانے لگی۔ کچھ دنوں کے بعد اُسے معلوم ہوا، مجھے یہ دولت بھی میسّر ہے۔ مگر چند ہی دنوں میں یہ وہم دور ہو گیا۔ کنور گجراج سنگھ خوب صورت تھے۔ تندرست تھے۔ تعلیم یافتہ تھے۔ بذلہ سنج تھے۔

اور محبت کا پارٹ کرنا بھی جانتے تھے۔ مگر ان کی زندگی میں محبت سے مرتعش ہونے والا تار نہ تھا۔ دسودھا کا کھلا ہوا شباب، اور دیوتاؤں کو بھی لبھا لینے والا رنگ روپ محض ان کی دل بستگی کا سامان تھا۔ گھڑ دوڑ اور شکار جیسے ولولہ انگیز مشاغل کے درمیان دب کر محبت پیلی اور نیم جان ہو گئی تھی۔ اور محبت سے محروم ہو کر اب دسودھا کا دل اپنی بدقسمتی پر آنسو بہاتا تھا۔ وہ چاند سے بچے پا کر بھی وہ خوش نہ تھی۔ کنور صاحب ایک مہینہ سے زیادہ ہوا۔ شکار کھیلنے گئے۔ اور ابھی تک لوٹ کر نہیں آئے۔ اور یہ اپنی قسم کا پہلا موقعہ نہ تھا۔ ہاں، اب اس کی مدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ پہلے ایک ہفتہ میں لوٹ آتے تھے۔ پھر دو ہفتوں کا دَور چلا۔ اور اب ایک مہینے کی خبر لینے لگے۔ سال میں تین تین چار چار مہینے شکار کی نذر ہو جاتے تھے۔ شکار سے لَوٹتے، تو گھڑ دوڑ کا راگ چھڑ جاتا۔ کبھی میرٹھ، کبھی پونا، کبھی بمبئی، کبھی کلکتہ، گھر پر بھی رہتے، تو رئیس زادوں کے ساتھ گپ شپ اُڑایا کرتے۔ شوہر کے یہ لچھن دیکھ کر دسودھا دل ہی دل میں کُڑھتی۔ اور گھُلی جاتی تھی۔ کچھ دنوں سے ہلکا ہلکا بخار بھی آنے لگا تھا۔

دسودھا بڑی دیر بیٹھی یہ منظر دیکھتی رہی۔ پھر ٹیلیفون پر جا کر اس نے ریاست کے منیجر سے پوچھا:-

"کنور صاحب کی کوئی چٹھی آئی؟"

جواب ملا۔ "جی ہاں، ابھی چٹھی آئی ہے۔ کنور صاحب نے ایک بہت بڑا شیر مارا ہے۔"

دسودھا نے جل بھُن کر کہا۔ "میں یہ نہیں پوچھتی، آنے کو کب لکھا ہے؟"

منیجر: "آنے کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔"

رانی: "یہاں سے ان کا پڑاؤ کتنی دور ہے؟"

منیجر: "یہاں سے؟ دو سو میل سے کم نہ ہوگا۔ پیلی بھیت کے جنگلوں میں شکار ہو رہا ہے۔"

رانی: "میرے لئے دو موٹروں کا انتظام کر دیجئے۔ میں آج ہی وہاں جانا چاہتی ہوں۔"

فون میں کئی منٹ بعد جواب ملا۔ "ایک موٹر تو وہ ساتھ لے گئے ہیں۔ ایک حاکم ضلع کے بنگلہ پر بھیج دی گئی ہے۔ تیسری منیجر بنک کی سواری میں ہے۔ چوتھی کی مرمت ہو رہی ہے۔"

رانی دسودھا کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہو گیا۔ بولی۔ "کس کے حکم سے منیجر بنک اور حاکم ضلع کو موٹریں بھیجی گئی ہیں۔ آپ دونوں منگوا لیجئے۔ میں آج ضرور جاؤں گی۔"

منیجر: "میں ابھی منگوائے دیتا ہوں۔"

دسودھا نے سفر کی تیاری شروع کر دی۔ اس نے اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا تصفیہ کر لیا۔ وہ قابلِ رحم زندگی بسر نہ کرے گی۔ وہ جا کر کنور صاحب سے کہے گی۔ اگر آپ چاہتے ہیں، کہ میں آپ کی دولت کی لونڈی بن کر رہوں، تو یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ آپ کی شان و شوکت آپ کو مبارک ہو۔ میرا اختیار آپ کی دولت پر نہیں۔ آپ پر ہے۔ اگر آپ مجھ سے جو بھر ہٹنا چاہتے ہیں، تو میں آپ سے ہاتھ بھر ہٹ جاؤں گی۔ اس طرح کی کتنی ہی باتیں اس کے دل میں پانی کے بلبلوں کی طرح اٹھ رہی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے دروازہ پر آ کر پکارا۔

"میں اندر آجاؤں ؟"

دسودھا نے عاجزی سے کہا "آج معاف کیجئے۔ میں ذرا پیلی بھیت جا رہی ہوں"

ڈاکٹر نے حیرت سے کہا "آپ پیلی بھیت جا رہی ہیں! بخار بڑھ جائے گا۔ اس حالت میں آپ کو جانے کا مشورہ نہ دوں گا"

دسودھا نے بے پروائی سے جواب دیا "بڑھ جائے گا، تو بڑھ جائے مجھے اس کی کوئی پروا نہیں"

بوڑھا ڈاکٹر پردہ اُٹھا کر اندر گیا۔ اور دسودھا کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولا۔

"لایئے، ٹمپریچر لے لوں۔ اگر ٹمپریچر زیادہ ہوا، تو میں نہ جانے دوں گا"

دسودھا: "ٹمپریچر لینے کی ضرورت نہیں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے"

ڈاکٹر: "صحت کا خیال رکھنا آپ کا پہلا فرض ہے"

دسودھا نے مسکرا کر کہا "آپ اطمینان رکھئے۔ میں اتنی جلدی مری نہیں جا رہی ہوں۔ پھر اگر کسی بیماری کی دوا موت ہی ہو، تو آپ کیا کریں گے ؟"

ڈاکٹر نے ایک دو مرتبہ اور زور دیا۔ پھر تعجب سے سر ہلا کر چلا گیا۔

۲

ریل گاڑی سے جانے میں آخری سٹیشن سے دس کوس تک غیر آباد جنگلی راستہ طے کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے کنور صاحب ہمیشہ موٹر ہی سے جایا کرتے تھے۔ دسودھا نے بھی اسی راستہ سے جانے کا فیصلہ کیا۔

دس بجے "بچے" دونوں موٹریں آگئیں۔ دسودھا نے سارا غصہ ڈرائیوروں پر اُتارا۔" اب اگر میرے حکم کے بغیر کہیں موٹرلے گئے۔ تو کان پکڑ کر نکال دوں گی اچھی دل لگی ہے۔ گھر کی روئی۔ بن کی گائیں۔ موٹریں لوگ اپنے لئے رکھتے ہیں۔ غیروں کے لئے نہیں۔ جسے سواری کا شوق ہو۔ خرچ کرے۔ یہ نہیں کہ حلوائی کی دکان دیکھی، اور فاتحہ پڑھنے بیٹھ گئے۔"

وہ چلی، تو دونوں بچے رونے لگے۔ مگر جب یہ معلوم ہوا، کہ اماں بڑی دور ہوا مارنے جارہی ہیں۔ تو اُن کی آتشِ شوق سرد ہوگئی۔ دسودھا نے آج صبح سے انہیں پیار نہ کیا تھا۔ اس نے غصہ میں سوچا "میں کیوں انہیں پیار کروں، کیا میں نے ہی پیار کا ٹھیکہ لیا ہے؟ وہ تو وہاں چین سے بیٹھے رہیں۔ میں انہیں چھاتی سے لگائے رہوں۔" لیکن چلتے وقت ماں کا دل بے تاب ہوگیا۔ دونوں کو باری باری سے گود میں اُٹھا کر پیار کیا۔ اور گھنٹہ بھر میں لوٹ آنے کا چکمہ دے کر موٹر میں بیٹھ گئی۔ راہ میں بھی بچوں کی یاد بار بار آتی رہی۔ موٹر جس رفتار سے آگے جارہی تھی۔ اسی رفتار سے اس کا دل سامنے کے درختوں کے ساتھ پیچھے کی طرف اڑا جارہا تھا۔ کئی مرتبہ خواہش ہوئی، گھر لوٹ چلوں۔ جب انہیں میری پروا نہیں۔ تو میں ہی ان کے لئے کیوں جان دوں؟ خواہ آئیں یا نہ آئیں۔ پھر خیال آیا، ایک مرتبہ جا کر کھری کھری سنا آؤں۔ تو چین پڑے۔ سارا جسم تھک کر چُور چُور ہو رہا تھا۔ بخار بھی ہو گیا تھا۔ سر درد کے مارے پھٹا پڑتا ہے۔ لیکن آہنی ارادہ کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ یہاں تک، کہ جب وہ رات کے دس بجے ڈاک بنگلے میں پہنچی، تو اسے تن بدن کی سُدھ نہ تھی۔

شوفر کی آواز سنتے ہی کنور صاحب باہر نکل آئے۔ اور پوچھا "تم یہاں کیسے آگئے۔ خیریت تو ہے؟"

شوفر نے قریب آکر کہا۔ "رانی صاحبہ آئی ہیں۔ حضور، راہ میں بخار ہو گیا۔ بے ہوش پڑی ہیں"

کنور صاحب نے وہیں کھڑے سخت لہجہ میں پوچھا۔ "تو تم انہیں واپس کیوں نہ لے گئے؟ کیا تمہیں معلوم نہ تھا، یہاں کوئی ڈاکٹر نہیں ہے"

شوفر نے سٹپٹا کر جواب دیا۔ "حضور، وہ کسی طرح مانتی ہی نہ تھیں۔ میں کیا کرتا؟"

کنور صاحب نے ڈانٹ کر کہا۔ "چپ رہو۔ باتیں نہ بناؤ۔ تم نے سمجھا ہوگا۔ شکار کی بہار دیکھیں گے۔ اور پڑے پڑے سوئیں گے۔ تم نے واپس چلنے کو کہا ہی نہ ہوگا۔ میں تم لوگوں کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ تم کو موٹر لے کر اسی وقت لوٹنا پڑے گا۔ اور کون کون ساتھ ہے؟"

شوفر نے دبی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "ایک موٹر پر بستر اور کپڑے ہیں۔ ایک پر خود رانی صاحبہ ہیں"

کنور: "یعنی اور کوئی ساتھ نہیں ہے"

شوفر: "حضور، میں تو حکم کا بندہ ہوں"

کنور: "بک بک مت کرو جی"

یوں جھلائے ہوئے کنور صاحب دسودھا کے پاس گئے۔ اور آہستہ سے پکارا۔ جب کوئی جواب نہ ملا۔ تو انہوں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ پیشانی توے کی طرح تپ رہی تھی۔ اس بخار کی آنچ نے گویا

ان کے غصّہ کی آگ کو سرد کر دیا۔ لپک کر بنگلے میں گئے۔ سوئے ہوئے آدمیوں کو جگایا۔ پلنگ بچھوایا۔ بے ہوش دسودھا کو گود میں اُٹھا کر اندر لے گئے۔ اور پلنگ پر لٹا دیا۔ پھر اس کے سرہانے بیٹھ کر اُسے اشک آلود نگاہوں سے تاکنے لگے۔ اس کے گرد سے بھرے ہوئے چہرے اور بکھرے ہوئے بالوں میں آج انہیں بے غرض محبت نظر آئی۔ آج تک انہوں نے دسودھا کو خود پرست نازنین کے روپ میں دیکھا تھا۔ جسے ان کے پیار کی پروا نہ تھی۔ جو اپنے بناؤ سنگار میں مست تھی۔ آج گرد و غبار کے پوڈر اور پومیڈ میں انہوں نے اس کی نسائیت دیکھی۔ اس میں کتنی حسرت تھی۔ کتنی التجا۔ اپنی پرواز کے سرور میں ڈوبی ہوئی چڑیا اب پنجرے کے دروازہ پر آکر پھڑپھڑا رہی تھی۔ کیا پنجرے کا دروازہ کُھل کر اس کا خیر مقدم نہ کرے گا؟

کنور صاحب نے شیریں لہجہ میں کہا۔ "جی ہاں، اتنے آدمی تھے۔ کسی کو ساتھ نہ لیا۔ ریل گاڑی میں بڑے آرام سے آسکتی تھیں۔ یہاں سے موٹر بھیج دی جاتی۔ کتنا تیز بخار ہے۔ ہاتھ نہیں رکھا جاتا۔" پھر انہوں نے باورچی کو کہا۔ "ذرا سا گرم پانی لاؤ۔ اور دیکھو کچھ کھانے کو بنا لو۔"

باورچی نے کہا۔ "سو کوس کی دوڑ بہت ہوتی ہے۔ سرکار، سارا دن بیٹھے بیٹھے بیت گیا۔"

کنور صاحب دسودھا کے سر کے نیچے سرہانہ سیدھا کر کے بولے۔ "اجی ہم لوگوں کا کچومر نکل جاتا ہے۔ پھر ان کی کیا ہے۔ ایسی بیہودہ سڑک دنیا بھر میں نہ ہوگی۔"

۳

دسودھا کا بخار بارہ دن تک نہ اُترا۔ گھر سے ڈاکٹر آئے۔ دونوں بچے، منیا، نوکر چاکر سبھی آ گئے۔ جنگل میں منگل ہو گیا۔ دسودھا پلنگ پر پڑے کنور صاحب کی تندہی اور خدمت گذاریاں دیکھتی۔ اور خوش ہوتی تھی۔ دس بجے تک جن کی آنکھ نہ کھلتی تھی۔ وہی کنور صاحب اب منہ اندھیرے اُٹھ بیٹھتے تھے۔ اور اس کی دوا دارو کا فکر کرنے لگتے تھے۔ ذرا سی دیر کو نہانے کو جاتے۔ پھر آ کر بیٹھ جاتے جیسے تہجد میں مصروف ہوں۔ ان کی صحت بگڑتی جاتی تھی۔ چہرے پر وہ سُرخی اور چمک نہ تھی۔ تھکے تھکے معلوم ہوتے تھے۔

ایک دن دسودھا نے پوچھا۔ "تم آج کل شکار کھیلنے کیوں نہیں جاتے؟ میں تو شکار کھیلنے ہی آئی تھی۔ نہ جانے کیسی بُری ساعت میں چلی، کہ تمہیں اتنی تکلیف اُٹھانی پڑی۔ ذرا آئینہ میں اپنی صورت تو دیکھو۔"

کنور صاحب کو اتنے دنوں تک کبھی شکار کا خیال ہی نہ آیا تھا۔ نہ اس کا کبھی چرچا ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک شکاری نے کسی شیر کا ذکر کیا تھا۔ کنور صاحب نے اس کی طرف ایسی قہر آلود نگاہوں سے دیکھا، کہ اسے دوبارہ ہمت نہ پڑی۔ اب وہ چاہتے تھے۔ ہمیشہ دسودھا کے پاس بیٹھ کر اس سے باتیں کرتے رہیں۔ پل بھر کو بھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہوں۔ دسودھا کے منہ سے شکار کا ذکر سُن کر ان کا سر ندامت سے جھک گیا۔ آہستہ سے بولے۔ "ہاں شکار کھیلنے کا اس سے اچھا اور کون موقعہ

ہو گا؟"

دسودھا بولی:" میں تو اب اچھی ہوں۔ ذرا اپنی صورت دیکھو، بیمار کے پاس بیٹھ کر آدمی سچ مچ بیمار ہو جاتا ہے۔"

دسودھا نے تو معمولی سی بات کہی تھی۔ پر کنور صاحب کے دل پر وہ چنگاری کی مانند لگی۔ اس سے پہلے وہ اپنے شکار کے جنون پر کئی مرتبہ پچھتا چکے تھے۔ سوچتے تھے:" اگر یوں شکار کے پیچھے نہ پڑتے، تو دسودھا بیمار کیوں ہوتی۔ یہ سب میرا ہی قصور ہے۔"

دسودھا پھر بولی:" اب کے تم نے کیا کیا تحفے جمع کئے؟ ذرا منگواؤ، میں بھی دیکھوں۔ ان میں جو سب سے اچھا ہوگا، وہ میں لوں گی۔ اور ایک بات اور سُن لو۔ اب کے تمہارے ساتھ میں شکار کھیلنے چلوں گی۔ لے چلوگے نا؟ بہلانے مت بنانا، میں ایک نہ سُنوں گی۔"

اپنے شکاری تحفے دکھانے کا کنور صاحب کو مرض تھا۔ سینکڑوں کھالیں جمع کر رکھی تھیں۔ ان کے کمروں میں فرش، گدے، کوچ، کرسیاں اور مونڈھے سب کھالوں کے تھے۔ اوڑھنا اور بچھونا بھی کھالوں کا ہی تھا۔ کھالوں کے کئی سوٹ بنوا رکھے تھے۔ شکار کے موقعہ پر وہی سوٹ پہنتے تھے اب کے بھی بہت سے سینگ، پنجے، کھالیں، جمع کی تھیں۔ انہوں نے سوچا۔ دسودھا یہ چیزیں دیکھ کر خوش ہو جائے گی۔ یہ نہ سمجھا، کہ اس نے صدر دروازہ بند پاکر چور دروازہ سے گھسنے کی کوشش کی ہے۔ جا کر وہ اشیاء اُٹھا لائے۔ اور ایک ایک کر کے دکھانے لگے۔

دسودھا کے چہرے پر ایسی رونق ہفتوں سے نہ تھی۔ جیسے کوئی بچہ تماشہ دیکھ کر خوش ہو رہا ہو۔ بیماری کے بعد ہم بچوں کی طرح ضدی۔ ویسے

ہی متلون مزاج، ویسے ہی سادہ لوح بن جاتے ہیں۔ دسودھا ایک ایک کھال کو ایسی دلچسپی سے دیکھنے لگی۔ جیسے بائیسکوپ میں ایک تصویر کے بعد دوسری تصویر آرہی ہو۔ سب سے خوبصورت ایک شیر کی کھال تھی۔ وہ اس نے اپنے لئے پسند کی۔ کنور صاحب کی یہ سب سے قیمتی چیز تھی۔ وہ اسے اپنے کمرے میں لٹکانا چاہتے تھے۔ بولے: "تم کسی چیتے کی کھال لے لو۔ یہ تو کوئی عمدہ چیز نہیں ہے۔"

دسودھا نے کھال کو اپنی طرف کھینچ کر کہا: "رہنے دیجئے اپنا اپدیش۔ مجھے یہ خراب ہی پسند ہے۔"

کنور صاحب نادم سے ہو کر بولے: "تو یہی لے لو۔ میں تمہارے ہی خیال سے کہتا تھا۔ میرا کیا ہے۔ میں پھر ایسا ہی شیر مار لوں گا۔"

دسودھا: "تو مجھے چکمہ کیوں دیتے تھے؟"

کنور: "چکمہ کون دیتا تھا؟"

دسودھا: "تو کھاؤ۔ میرے سر کی قسم۔ کہ یہ کھال سب سے بڑھیا نہیں ہے؟"

کنور صاحب نے شکست کی ہنسی ہنس کر کہا: "قسم کیوں کھائیں؟ اس ذراسی کھال کے لئے۔ ایسی ایسی سو کھالیں ہوں، تو تمہارے سر پر نثار کر دوں۔"

جب آدمی سب کھالیں لے کر چلا گیا، تو کنور صاحب نے کہا۔ "میں اس کھال پر سیاہ اون سے تمہارا نام لکھ کر تمہاری نذر کروں گا۔"

دسودھا تھک گئی تھی۔ پلنگ پر لیٹ کر بولی: "اب میں بھی تمہارے

ساتھ شکار کھیلنے چلوں گی"

کنور صاحب مسکرانے لگے۔

۴

دسودھا کو شکار کی کہانیاں سننے کا چسکا سا پڑ گیا۔ اب تک کنور صاحب کی دنیا الگ تھی۔ جس کے دکھ سکھ، نفع نقصان، بننے بگڑنے سے دسودھا کو کوئی سروکار نہ تھا۔ کنور صاحب اس دنیا کی ہر بات اس سے چھپاتے تھے۔ مگر اب دسودھا ان کی اس دنیا میں ایک درخشاں ستارہ کی طرح طلوع ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب کی اجازت ملنے میں توقف نہ ہوا۔ دسودھا تندرست ہو گئی تھی۔ کنور صاحب نے اچھی ساعت میں اسے پہلا سبق پڑھایا۔ اس دن سے جب دیکھو درختوں کے نیچے کھڑی نشانہ بازی کی مشق کر رہی ہے۔ اور کنور صاحب ساتھ کھڑے امتحان لے رہے ہیں۔ جس دن دسودھا نے پہلا باز مارا۔ کنور صاحب مسرت سے اچھل پڑے۔ نوکروں کو بخشیش دی، برہمنوں کو دان۔ اسی خوشی میں باز کی ممی بھی بنوائی گئی۔

دسودھا کی زندگی میں اب ایک نئی امنگ، ایک نئی راحت، ایک نئی امید تھی۔ پہلے کی طرح اس کا خالی دل اندیشوں سے نہ کانپتا تھا۔ اب اس میں حوصلہ تھا۔ قوت تھی، محبت تھی۔

۵

آخر کئی دنوں کے بعد دسودھا کی تمنّا بر آئی۔ کنور صاحب اسے ساتھ لے کر شکار کھیلنے کو رضامند ہوئے۔ اور شکار تھا شیر کا۔ شیر بھی وہ جس نے ایک مہینہ سے گرد و نواح کے گاؤں میں قیامت برپا کر رکھی تھی۔

چاروں طرف تاریکی تھی۔ ایسی سخت، کہ زمین اس کے بوجھ تلے کراہتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ دونوں ایک بلند مچان پر بندوقیں لئے دم روکے بیٹھے تھے۔ یہ شیر نہایت خوفناک تھا۔ ابھی ایک دن پیشتر ایک سوتے ہوئے آدمی کو کھیت میں مچان پر سے کھینچ کر لے گیا تھا۔ اسی شیر کی گھات میں دونوں شکاری بیٹھے تھے۔ نیچے کچھ فاصلہ پر بھینسا باندھ دیا گیا تھا اور اب شیر کے آنے کی راہ دیکھی جا رہی تھی۔ کنور صاحب مطمئن تھے۔ مگر دسودھا کا سینہ دھڑک رہا تھا۔ پتہ بھی ہلتا۔ تو چونک پڑتی۔ اور بندوق سیدھی کرنے کی بجائے کنور صاحب سے چمٹ جاتی۔ کنور صاحب اس کی ہمت بندھاتے جاتے تھے۔

"جونہی شیر بھینسے پر آیا، میں اس کا کام تمام کر دوں گا۔ تمہاری گولی کی نوبت ہی نہ آنے پائے گی۔"

دسودھا نے ڈر کر کہا "اور جو کہیں نشانہ چوک گیا۔ تو اُچھلے گا۔"

کنور۔ "پھر دوسری گولی چلے گی۔ تینوں بندوقیں تو بھری رکھی ہیں۔ تمہارا دل گھبراتا تو نہیں ہے؟"

دسودھا۔ "بالکل نہیں، میں تو چاہتی ہوں پہلے میری بندوق چلے۔"

پتوں کی کھڑکھڑ کی آواز آئی۔ دسودھا چونک کر شوہر سے چمٹ گئی۔ کنور صاحب نے اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر کہا۔ "دل مضبوط کرو پیاری!"

دسودھا نے ندامت سے جواب دیا۔ "نہیں نہیں، میں ڈرتی نہیں ہوں۔ ذرا چونک پڑی تھی۔"

معاً بھینسے کے پاس دو چنگاریاں سی چمک اُٹھیں۔ کنور صاحب نے آہستہ سے دسودھا کا ہاتھ دبا کر اسے شیر کے آنے کی اطلاع دی۔ اور

ہوشیار ہو گئے۔ جب شیر نزدیک آگیا۔ تو انہوں نے بندوق داغ دی۔ نشانہ خالی گیا۔ دوسرا فیر گیا۔ شیر زخمی تو ہوا۔ مگر گرا نہیں۔ غصہ سے پاگل ہو کر اس قدر زور سے گرجا۔ کہ دسودھا کا کلیجہ دہل گیا۔ کنور صاحب تیسرا فیر کرنے ہی کو تھے۔ کہ شیر نے مچان پر جست ماری۔ اس کے اگلے پنجوں کے دھکے سے مچان ایسا ہلا، کہ کنور صاحب بندوق لئے مچان سے نیچے گر پڑے۔ کتنا نازک موقعہ تھا، اگر ایک لمحہ کی بھی دیر ہو جاتی، تو کنور صاحب کی خیر نہ تھی۔ شیر کی جلتی ہوئی انگارہ سی آنکھیں دسودھا کے سامنے چمک رہی تھیں۔ ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ لیکن اس خطرہ نے جیسے اس کی نس نس میں بجلی بھر دی۔ اس نے اپنی بندوق سنبھالی۔ شیر کے اور اس کے درمیان دو ہاتھ سے زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ وہ اُچک کر آیا ہی چاہتا تھا، کہ دسودھا نے بندوق چھوڑ دی۔ دھائیں! شیر کے پنجے ڈھیلے پڑ گئے نیچے گر پڑا! اب صورت حال اور بھی خطرناک تھی۔ شیر سے تین چار قدم کے فاصلے پر کنور صاحب گرے تھے۔ شاید چوٹ زیادہ آئی ہو۔ شیر میں اگر ابھی دم ہے، تو ضرور ان پر وار کرے گا۔ دسودھا کی جان آنکھوں میں تھی۔ ریوالور کلائیوں میں۔ اس وقت اگر کوئی اس کے جسم میں نیزہ بھی چبھو دیتا، تو اُسے خبر نہ ہوتی۔ وہ اپنے ہوش میں نہ تھی۔ پر اس کی بے ہوشی ہی اس کی رہبر تھی۔ اس نے ٹارچ جلائی۔ دیکھا شیر اُٹھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دوسری گولی سر پر ماری۔ اور ریوالور لئے مچان سے کود پڑی۔ شیر زور سے غرّایا۔ دسودھا نے اس کے منہ کے سامنے ریوالور خالی کر دیا۔ کنور صاحب سنبھل کر کھڑے ہو گئے۔ اور دوڑ کر دسودھا کو چھاتی سے لگا لیا۔

"ارے یہ کیا؟"

دسودھا بے ہوش تھی۔ خوف اس کی جان کو مٹھی میں لئے اس کی حفاظت کر رہا تھا۔ خوف کے ہٹتے ہی بے ہوشی اس پر غالب آگئی"۔

۶

تین گھنٹوں کے بعد دسودھا کو ہوش آیا۔ لیکن گھبراہٹ ابھی تک باقی تھی۔ اس نے آہستہ سے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ کنور صاحب نے پوچھا۔

"کیوں پیاری کیا حال ہے اب؟"

دسودھا نے بے ہوشی میں اپنے ہاتھوں کا حلقہ بناتے ہوئے کہا۔

"وہاں سے ہٹ جاؤ۔ کہیں حملہ نہ کر بیٹھے"۔

کنور صاحب نے ہنس کر کہا۔

"شیر کب کا ٹھنڈا ہو گیا۔ برآمدہ میں پڑا ہے۔ اتنا بڑا شیر میں نے کبھی نہیں دیکھا"۔

دسودھا۔ "تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

کنور۔ "بالکل نہیں۔ تم کود کیوں پڑیں؟ پیروں میں بڑی چوٹ آئی ہوگی؟ مجھے تو تعجب ہے، کہ تم بچ کیونکر رہیں؟ اتنی بلندی سے میں کبھی کود نہ سکتا"۔

دسودھا (تعجب سے) میں کہاں کودی۔ شیر مچان پر آیا۔ اتنا یاد ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا مجھے یاد نہیں"۔

کنور صاحب کو اور بھی تعجب ہوا۔ "واہ تم نے اس پر دو گولیاں چلائیں جب وہ نیچے گر پڑا۔ تو تم بھی کود پڑیں۔ اور اس کے منہ میں ریوالور کی گولی

ٹھونس دی - بڑا بے حیا جانور تھا - اگر تم چوک جاتیں، تو وہ پیچھے آتے ہی مجھ پر حملہ کرتا - میرے پاس تو چھری بھی تھی - بندوق ہاتھ سے چھٹ کر دوسری طرف گر گئی تھی - اندھیرے میں کچھ نظر نہ آتا تھا بس مجھے تم نے بچا لیا - ورنہ اس وقت میں یہاں کھڑا نہ ہوتا۔"

دوسرے دن وہاں سے کوچ ہوا -

جو محل دسودھا کو پھاڑے کھاتا تھا - اس میں جا کر آج ایسی مسرت حاصل ہوئی - جیسے کسی بچھڑی ہوئی سہیلی سے ملی ہو - ہر ایک چیز اس کا خیر مقدم کرتی معلوم ہوتی تھی - جن نوکروں اور لونڈیوں سے مہینوں سیدھے منہ بات نہ کرتی تھی - ان سے آج ہنس ہنس کر بولتی تھی - گویا گذشتہ سرد مہریوں کی تلافی کر رہی تھی -

شام کا سورج آسمان کے سنہرے ساگر میں اپنی کشتی کھیتا چلا جا رہا تھا - دسودھا کھڑکی کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر سامنے کا نظارہ دیکھنے لگی - اس منظر میں آج زندگی تھی - امید تھی، ولولہ تھا - ملاح کا وہ سونا جھونپڑا بھی آج کتنا خوب صورت معلوم ہوتا تھا - قدرت میں دلکشی بھری تھی -

مندر کے سامنے مینا راجکمار کو کھلا رہی تھی - دسودھا کو مندر میں جا کر پوجا کرنے کا خیال آیا - اس نے پوجا کا سامان منگوایا - اور مندر کی طرف چلی - خوشی کے بھرے خزانے سے اب وہ کچھ خیرات بھی کر سکتی تھی - جلتے ہوئے دل سے شعلوں کے سوائے اور کیا نکل سکتا ہے؟

اتنے میں کنور صاحب آ کر بولے -

"اچھا، پوجا کی تیاریاں ہو رہی ہیں - میں بھی وہیں جا رہا تھا - کچھ دن ہوئے میں نے ایک منت مانی تھی۔"

دسودھا نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا۔

"کیسی منت مانی تھی آپ نے؟"

کنور صاحب نے جواب دیا۔

"یہ نہ بتاؤں گا۔"

آخری حیلہ

اگرچہ میرا حافظہ بہت قوی نہیں۔ تاریخ دنیا کی ساری اہم تاریخیں فراموش ہوگئیں۔ وہ ساری تاریخیں جنہیں راتوں کو جاگ کر۔ جبر ڈال کر یاد کیا تھا۔ مگر شادی کی تاریخ اس ہموار میدان میں ایک ستون کی طرح اٹل ہے۔ نہ بھولتا ہوں۔ نہ بھول سکتا ہوں۔ اس سے قبل و مابعد کے سارے واقعات دل سے محو ہو گئے۔ ان کا نشان تک باقی نہیں۔ وہ ساری کثرت ایک وحدت میں مضمر ہو گئی۔ اور وہ میری شادی کی تاریخ ہے۔ چاہتا ہوں اُسے بھول جاؤں۔ مگر جس تاریخ کو روزانہ یاد کیا جاتا ہو۔ وہ کیسے بھول جائے۔ اور یاد کیوں کرتا ہوں؟ یہ اس مبتلائے غم سے پوچھئے۔ جسے نام خدا کے سوا زندگی سے نجات کا کوئی وسیلہ باقی نہ رہا ہو۔

لیکن کیا میں تاہل سے اس لئے بھاگتا ہوں۔ کہ میں زاہد خشک ہوں۔ اور صنفِ لطیف کی دل رُبائیوں سے بے اثر؟ کیا میں نہیں چاہتا، کہ جب میں سیر کرنے نکلوں۔ تو اہلیہ بھی جلوہ افروز ہوں۔ تکلفات کی دکانوں پر اُن

سے کے ساتھ جا کر تھوڑی دیر کے لئے معشوقانہ التجا کا لطف اُٹھاؤں؟ میں اس شان و مسرت اور غرور کا اندازہ کر سکتا ہوں۔ جو میرے دوسرے بھائیوں کی طرح میرے دل میں بھی تموّج پذیر ہوگا۔ لیکن میری تقدیر میں وہ خوشیاں اور رنگ رلیاں نہیں۔ کیونکہ تصویر کا دوسرا رُخ بھی تو دیکھتا ہوں۔ ایک رُخ جتنا ہی دلفریب اور خوشنما ہے، دوسرا اتنا ہی دلشکن اور ہیبت ناک۔ شام ہوئی اور آپ بچّے کو گود میں لئے تیل یا ایندھن والے کی دکان پر کھڑے ہیں۔ اندھیرا ہوا۔ اور آپ آٹے کی پوٹلی بغل میں دبائے گلیوں میں یوں قدم بڑھاتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔ گویا چوری کی ہے۔ صبح ہوئی۔ اور بچوں کو گود میں لئے ہومیو پیتھک ڈاکٹر کی دکان میں ٹوٹی کرسی پر رونق افروز ہیں۔ کسی خوانچے والے کی صدائے نوشش آیند سُن کر بچے نے نالۂ فلک رسا بلند کیا۔ اور آپ کی روح قبض ہوئی۔ ایسے باپوں کو بھی دیکھا ہے۔ جو دفتر سے لوٹتے ہوئے پیسے دو پیسے کی مونگ پھلی یا ریوڑیاں لے کر بہ سُرعت تمام منہ میں رکھتے چلے جاتے ہیں۔ کہ گھر پہنچتے پہنچتے بچوں کی یورش سے قبل وہ ذخیرہ ختم ہو جائے۔ کتنا مایوس کن ہوتا ہے وہ نظارہ۔ جب دیکھتا ہوں کہ میلے میں بچہ کسی کھلونے کی دکان کے سامنے مچل رہا ہے اور قبلہ گاہی صاحب واعظانہ سرگرمی سے کھلونوں کی بے حقیقتی کا راگ الاپ رہے ہیں۔

تصویر کا پہلا رُخ تو میرے لئے ایک شیریں خواب ہے۔ دوسرا رُخ ایک روح فرسا حقیقت۔ اس حقیقت کے سامنے میرا سارا ذوقِ تاہل فنا ہو جاتا ہے۔ میری ساری قوت ایجاد، میری ساری فکر رسا اسی تاہل کے پھندوں سے بچنے میں صرف ہوتی ہے۔ دانہ تہ دام ہے۔ یہ جتنا ہوں، مگر کتنا گراں، کتنا مہلک، دام خوشرنگ ہے۔ بالکل سُنہرے تاروں کا بنا ہوا۔ اس میں طائروں کو تڑپتے

اور پھر پھڑاتے دیکھتا ہوں۔

لیکن ادھر کچھ دنوں سے اہلیہ نے پیہم تقاضے کرنے شروع کئے' کہ مجھے بلالو۔ پہلے چھٹیوں میں جاتا تھا' تو میرا محض" کہاں چلوگی" کہہ دینا اس کے اطمینان قلب کے لئے کافی ہوتا تھا۔ پھر میں نے" فضول ہے" کہہ کر اسے تسکین دینا شروع کیا۔ اس کے بعد خانہ داری کی پریشانیوں سے تخویف کی۔ مگر اب کچھ دنوں سے اس کی بے اعتباری بڑھتی جاتی ہے۔ اب میں نے چھٹیوں میں بھی اس کے تقاضے کے خوف سے گھر جانا بند کر دیا ہے۔ کہ کہیں وہ میرے ساتھ نہ چل کھڑی ہو۔ اور انواع واقسام کے حیلوں سے اُسے ڈراتا رہتا ہوں۔

میرا پہلا حیلہ اخبار نویس کی زندگی کی مشکلات سے متعلق تھا۔ بے انتہا تکلیف دہ' کبھی بارہ بجے رات کو سونا نصیب ہوتا ہے۔ کبھی ساری رات لکھنا پڑتا ہے۔ صبح ہوتے ہی وہی داد و دہش' وہی ہنگامہ آرائی' اس پر طرہ یہ کہ سر پر ایک برہنہ شمشیر لٹکتی رہتی ہے۔ نہ جانے کب گرفتار ہو جاؤں۔ کب ضمانت طلب ہو جائے خفیہ پولیس کی ایک فوج ہمیشہ پیچھے پڑی رہتی ہے۔ کبھی بازار میں نکل جاتا ہوں تو لوگ انگلیاں اُٹھا اُٹھا کر کہتے ہیں۔ وہ جا رہا ہے اخبار والا۔ دنیا میں جتنی آفاتِ ارضی و سماوی' نسلی و مذہبی' ملکی و قومی ہیں۔ ان کا ذمہ دار میں ہوں۔ گویا میرا دماغ جھوٹی خبریں گھڑنے کا کارخانہ ہے۔ سارا دن افسروں کی سلامی اور پولیس کی خوشامد میں گذر جاتا ہے۔ کنسٹبلوں کو دیکھا۔ اور روح فنا ہوئی' کہ خدا جانے کیا آفت برپا کریں۔ میری تو یہ حالت' اور حکام ہیں' کہ میری صورت سے ہراساں ایک دن شامت اعمال سے کسی انگریز کے بنگلے کی طرف جا نکلا۔ صاحب نے پوچھا۔ کیا کام کرتا ہے؟ میں نے ایک شان کے ساتھ کہا۔ اخبار کا ایڈیٹر ہوں۔ صاحب فوراً اندر گھس گئے۔ اور دروازہ بند کر لیا۔ پھر میں نے میم صاحبہ اور بادا لوگوں کو

کھڑکیوں سے جھانکتے دیکھا۔ گویا کوئی خطرناک جانور ہے۔ ایک بار ریل گاڑی میں سفر کا اتفاق ہوا۔ ساتھ اور بھی کئی دوست تھے۔ اس لئے اپنے پیشے کا وقار قائم رکھنے کے لئے سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لینا پڑا۔ گاڑی میں بیٹھا تو ایک صاحب نے میرے سوٹ کیس پر میرا نام اور پیشہ دیکھتے ہی فوراً اپنا صندوق کھولا۔ اور ریوالور نکال کر میرے روبرو اس میں گولیاں بھریں۔ تاکہ مجھے معلوم ہو جائے، کہ وہ مجھ سے بے خبر نہیں۔

میں نے اپنی مالی پریشانیوں کا ذکر مطلق نہیں کیا۔ کیونکہ میں جنسِ لطیف سے ایسا تذکرہ کرنا اپنی شانِ مردانگی کے خلاف سمجھتا ہوں۔

مجھے یقین تھا کہ اہلیہ اس خط کے بعد پھر یہاں آنے کے لئے اصرار نہ کریں گی۔ مگر یہ خیال غلط نکلا۔ اور ان کے تقاضے بدستور قائم ہے۔

تب میں نے دوسرا حیلہ سوچا۔ شہروں میں بیماریوں کی گرم بازاری ہے۔ ہر ایک کھانے پینے کی چیز میں سمیت کا اندیشہ۔ دودھ میں سمیت، گھی پھلوں میں سمیت، سبزی میں سمیت۔ ہوا میں سمیت، پانی میں سمیت۔ یہاں انسان کی زندگی نقش برآب ہے جسے آج دیکھو، وہ کل غائب۔ اچھے خاصے بیٹھے ہیں۔ دل کی حرکت بند، گھر سے سیر کرنے نکلے۔ موٹر سے ٹکرا کر راہیٔ عدم۔ اگر کوئی شام کو زندہ سلامت گھر آجائے، تو اُسے خوش نصیب سمجھو، مچھر کی آواز کان میں آئی۔ اور دل بیٹھا مکھی نظر آئی، تو ہاتھ پاؤں پھولے۔ چوہا بل سے نکلا، اور جان نکل گئی۔ جدھر دیکھئے۔ ملک الموت۔ اگر موٹر اور ٹرام سے بچ کر آگئے۔ تو مچھر اور مکھی کے شکار ہوں۔ کہاں بچ کر جاؤ گے۔ بس سمجھ لو موت ہردم سر پر کھیلتی رہتی ہے۔ ساری رات مچھروں سے جنگ کرتے گذرتی ہے۔ دن بھر مکھیوں سے لڑتا ہوں۔ ننھی سی جان کو کن کن دشمنوں سے بچاؤں۔ سانس

بھی مشکل سے لیتا ہوں۔ کہ کہیں کوئی تپ کا کیڑا پھیپھڑے میں نہ داخل ہو جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔

بیوی کو پھر یقین نہ آیا، دوسرے خط میں وہی اصرار موجود تھا۔ لکھا تھا "تمہارے خط نے ایک اور فکر پیدا کر دی۔ اب ہر روز خط لکھا کرنا۔ ورنہ میں ایک نہ سنوں گی۔ اور سیدھی چلی آؤں گی۔" میں نے دل میں کہا۔ چلو سستے چھوٹے۔ مگر یہ فکر لگا ہوا تھا، کہ نہ جانے کب انہیں شہر آنے کی سنک سوار ہو جائے۔ اس لئے میں نے ایک تیسرا حیلہ سوچ نکالا۔ یہاں دوستوں کے مارے جان عذاب میں رہتی ہے۔ احباب آکر بیٹھ جاتے ہیں، تو اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ گویا اپنا گھر بیچ کر آئے ہیں۔ اگر گھر سے ٹل جاؤ۔ تو آکر بے محابا کمرہ میں بیٹھ جاتے ہیں۔ اور نوکر سے سگریٹ، ناشتہ اُدھار منگوا کر کھاتے ہیں۔ دینا مجھے پڑتا ہے۔ بعض تو ہفتوں پڑے رہتے ہیں۔ ٹلنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ روزانہ ان کی خاطر و مدارات کرو۔ شام کو تھیٹر یا فلم دکھاؤ۔ رات کو ایک دو بجے تک تاش یا شطرنج کھیلو۔ اکثر احباب شراب کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتے۔ اکثر تو بیمار ہو کر آتے ہیں۔ بلکہ زیادہ تر بیمار ہی آتے ہیں۔ اب روزانہ ڈاکٹر کو بلاؤ۔ تیمارداری کرو۔ رات بھر سرہانے بیٹھے پنکھا جھلتے رہو۔ اکثر آکر دیکھتا ہوں، تو خدمت گار غائب ہے۔ گھنٹوں اس کی تلاش میں گھومتا ہوں۔ تب پتہ چلتا ہے، کہ ایک دوست نے اسے ذرا ایک کام سے بازار بھیج دیا تھا۔ میری گھڑی مہینوں سے میری کلائی پر نہیں آئی۔ دوستوں کے ساتھ جلسوں میں شریک ہو رہی ہے اچکن ہے تو وہ ایک صاحب کے پاس۔ کوٹ دوسرے صاحب لے گئے۔ جوتے ایک اور بابو لے اُڑے۔ میں وہی پرانا کوٹ اور وہی خارج شدہ جوتا پہن کر دفتر جاتا ہوں۔ احباب تاڑتے رہتے ہیں، کہ کون سی نئی چیز لایا۔

کوئی چیز لاتا ہوں، تو وہ صندوق میں بند پڑی رہتی ہے۔ استعمال کروں، تو کسی نہ کسی صاحب کی فرمائش ہو۔ پہلی تاریخ کو تنخواہ ملتی ہے، تو چوروں کی طرح دبے پاؤں گھر آتا ہوں۔ کہ کہیں کوئی صاحب اس لئے میرے منتظر نہ بیٹھے ہوں کہ آج ضرورت ہے۔ کچھ روپے دے دو۔ معلوم نہیں ان کی ضرورتیں پہلی تاریخ کی منتظر کیوں رہتی ہیں۔ ایک دن تنخواہ لے کر بارہ بجے رات کو لوٹا۔ مگر دیکھا اس وقت بھی دو اصحاب رونق افروز تھے۔ تقدیر ٹھونک لی۔ کتنے ہی بہانے کردں۔ ان کے سامنے ایک بھی پیش نہیں جاتی۔ میں کہتا ہوں، گھر سے خط آیا ہے۔ والدہ صاحبہ بہت بیمار ہیں۔ وہ جواب دیتے ہیں۔ اجی بوڑھے اتنے جلد نہیں مرتے۔ مرنا ہی ہوتا، تو اتنے دنوں زندہ کیوں رہتیں؛ دیکھ لینا دو چار روز میں اچھی ہو جائیں گی۔ کہتا ہوں، ارے یار گھر سے بہت ضروری خط آیا ہے مال گذاری کا سخت تقاضا ہو رہا ہے۔ جواب ملتا ہے۔ آج کل تو لگان بند ہو رہی ہے۔ اور تمہیں بھی اس کی تقلید کرنی چاہیے۔ اگر کسی تقریب کا حیلہ کرتا ہوں، تو فرماتے ہیں، تم بھی کیا عجیب المخلقت انسان ہو۔ ان بے ہودہ مراسم کی پابندی کرنا تمہاری شان کے خلاف ہے۔ اگر تم ان مراسم کی بیخ کنی نہ کرو گے، تو وہ لوگ کیا آسمان سے آئیں گے؟ خاموش ہو جاتا ہوں، کہ یہ کسی طرح گلا نہ چھوڑیں گے۔ پھر کیوں مفت میں سر پچی کروں؟

مجھے یقین تھا، کہ اس خط کے بعد بیوی پھر یہاں آنے کا نام نہ لے گی مگر اب کی پھر وہ خیال غلط نکلا۔ جواب میں وہی تقاضا تھا۔ خیریت اتنی ہوئی کہ انہوں نے خط لکھنے پر ہی اکتفا کی۔

تب میں نے چوتھا سوچا۔ یہاں کے مکان ہیں، کہ خدا کی پناہ۔ نہ

ہوا، نہ روشنی، نہ وسعت، اعراض ثلاثہ کا کہیں پتہ نہیں، وہ غضب کا تعفن، کہ دماغ پھٹا جاتا ہے۔ کتنوں کو تو اسی تعفن کے باعث مالیخولیا، اختلاج قلب، ضیق النفس، یا ٹائیفائیڈ ہو جاتا ہے۔ بارش ہوئی۔ اور مکان ٹپکنا شروع ہوا، پانی آدھ گھنٹہ برسے، مکان رات بھر رستا رہتا ہے۔ رات بھر مکانوں کے گرنے کی صدا آتی رہتی ہے۔ صبح کو اٹھو، تو کوئی یہاں ملبہ میں مدفون ہے۔ کوئی وہاں۔ رات کو وحشت ہوتی ہے۔ ایسے بہت کم مکان ہوں گے۔ جن میں پلید ارواح کا گذر نہ ہو۔ ہولناک خواب دکھائی دیتے ہیں۔ لوگ رات کو رو پڑتے ہیں، چیخ اٹھتے ہیں۔ کتنے ہی جنون میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ آج گھر میں آئے۔ کل مکان تبدیل کرنے کی فکر پیدا ہو گئی۔ کوئی ٹھیلہ اسباب سے لدا جا رہا ہے۔ کوئی آ رہا ہے۔ بس جدھر دیکھئے۔ ٹھیلے ہی ٹھیلے نظر آتے ہیں۔ چوریاں تو اس کثرت سے ہوتی ہیں۔ اگر کوئی رات خیریت سے گذر جائے، تو دیوتاؤں کی منت مانی جاتی ہے۔ آدھی رات ہوئی۔ اور چور چور، لینا لینا کی صدائیں بلند ہوئیں۔ لوگ دروازوں پر موٹے موٹے لکڑی کے بھٹے یا جوتے یا دست پناہ، یا چہل قدمی کی چھڑی لئے کھڑے رہتے ہیں۔ پھر بھی چور اتنے شاطر ہیں، کہ نظر بچا کر اندر پہنچ ہی جاتے ہیں۔ ایک میرے بے تکلف دوست ہیں۔ رات اندھیرے میں برتن کھڑکے۔ تو میں نے بجلی کی بتی جلائی۔ دیکھا، تو وہی حضرت برتن سمیٹ رہے ہیں۔ مجھے جاگتے دیکھ کر زور سے قہقہہ مارا۔ اور بولے۔ "میں تجھے چکمہ دینا چاہتا تھا؟" میں نے دل میں سمجھ لیا، کہ اگر نکل جاتے تو برتن آپ کے تھے۔ جاگ آ گئی۔ تو چکمہ ہو گیا۔ گھر میں آئے کیسے تھے؟ یہ معمہ تھا ہے۔ غالباً رات کو تاش کھیل کر چلے، تو باہر جانے کے بدلے نیچے اندھیری کوٹھڑی میں چھپ گئے۔

ایک دن ایک صاحب مجھ سے خط لکھوانے آئے۔ شامتِ اعمال، کمرہ میں قلم دوات نہ تھی۔ اوپر کے کمرہ سے لانے گیا۔ لوٹ کر آیا تو دیکھا کہ حضرت غائب ہیں۔ اور ان کے ساتھ گھڑی بھی غائب ہے۔

مگر میری بیوی پر شہری زندگی کا ایسا جادو چڑھا ہوا ہے، کہ میرا کوئی حیلہ اُسے خائف نہیں کرتا۔ اس خط کے جواب میں اس نے لکھا، کہ "تم مجھ پہ بہانے کرتے ہو۔ اور خود وہاں سیر سپاٹے کا لطف اُٹھاتے ہو۔ میں ہرگز نہ مانوں گی۔ آکر مجھے لے جاؤ۔"

آخر مجھے پانچواں حیلہ کرنا پڑا۔ یہ خوانچے والوں کے متعلق تھا۔ ابھی بستر سے اُٹھنے کی نوبت نہیں آئی، کہ کانوں میں عجیب و غریب صدائیں آنے لگیں۔ شاید بابل کے مینار کی تعمیر کے وقت بھی ایسی ہی گوناگوں مہمل صدائیں آتی ہوں گی۔ یہ خوانچے والوں کی صدائے بے ہنگام ہے۔ مناسب تو یہ تھا، کہ یہ سب نغمہ و چنگ کے ساتھ اپنی چیزوں کی جانب لوگوں کو مائل کرتے۔ یہاں کے موسیقی کالج میں چار پانچ سال اس ہنر کو حاصل کرتے۔ مگر ان اوندھی عقل والوں کو یہ کیا سوجھی ہے۔ اس طرح شیطانی صدائیں نکالتے ہیں، کہ سُننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ اور بچے ماں کی گود سے چمٹ جائیں۔ میں بھی تو اکثر راتوں کو چونک پڑتا ہوں۔ ایک روز تو میرے پڑوس میں ایک سانحہ ہو گیا۔ گیارہ بجے تھے۔ کوئی خاتون شاید بچے کو دودھ پلانے اٹھی تھیں۔ یکایک جو کسی خوانچے والے کی صدائے مہیب کانوں میں آئی۔ تو چیخ مار کر چلا اُٹھیں۔ اور پھر بے ہوش ہو گئیں۔ مہینوں کی دوا دارو کے بعد صحت ہوئی۔ اب رات کو کانوں میں روئی ڈال کر سوتی ہیں۔ ہر چند کہا گیا کہ خوانچے والے کی صدا تھی۔ پر انہیں یقین نہیں آتا۔ اور ایسے سانحے آئے دن

ہوتے رہتے ہیں۔ کئی احباب اپنی بیویوں کو لائے۔ مگر بے چاریاں دوسرے ہی دن ان صداؤں سے خائف ہو کر واپس چلی گئیں۔

مگر اہلیہ نے اسے بھی میرا حیلہ ہی سمجھا۔ "تم سمجھتے ہو کہ میں خوانچے والوں کی کی آواز سے ڈر جاؤں گی۔ یہاں گیدڑوں کا ہُوا ہُوا اور اُلوؤں کا شور سن کر تو ڈرتی نہیں۔ خوانچے والوں کی آواز سے ڈر جاؤں گی۔ مجھے ایسی باتوں سے نہ ڈرایئے۔"

آخر میں نے اب کی کوئی ایسا حیلہ سوچ نکالنے کی ٹھانی۔ جو اس خوف کا یکلخت خاتمہ کر دے۔ اہلیہ صاحبہ کو شہری زندگی سے مدت العمر کے لئے نفرت ہو جائے۔ کئی دنوں کے بعد مجھے ایک حیلہ سوجھا۔ اگرچہ اس میں کچھ رسوائی کا بھی اندیشہ تھا۔ لیکن رسوائی ہو جانے کا کوئی غم نہیں۔ وہ مصیبت تو سر پر نہ پڑے۔

میں نے لکھا، کہ یہ شریف زادیوں کے رہنے کی جگہ نہیں۔ یہاں کی مہریاں اتنی بد زبان ہیں، کہ باتوں کا جواب گالیوں سے دیتی ہیں۔ اور ان کی وضع قطع کا کیا پوچھنا۔ شریف زادیاں تو ان کا ٹھاٹھ دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہو جاتی ہیں۔ سر سے پاؤں تک سونے سے لدی ہوئی سامنے سے نکل جاتی ہیں، تو ایسا معلوم ہوتا ہے، خوشبو کی لپٹ نکل گئی۔ کوئی شریف عورت یہ ٹھاٹھ کہاں سے لائے گی۔ اسے تو اور بھی سیکڑوں فکر ہیں۔ انہیں تو بناؤ سنوار کے سوا دوسرا کام ہی نہیں۔ روز نئی سج دھج، نت نئی ادا، اور شوخ تو اس غضب کی ہیں۔ کہ گویا سیماب بھر دیا گیا ہو۔ ان کا چمکنا اور مٹکنا، لجانا اور مسکرانا دیکھ کر بیچاری بھلے گھروں کی عورتیں شرما جاتی ہیں۔ اور ایسی گستاخ ہیں، کہ خواہ مخواہ گھروں میں گھس پڑتی ہیں۔ کہیں کسی دوست کے گھر سے کوئی

چھیڑنے کر، کبھی کسی دوسرے بہانہ سے، کوئی کتنا ہی چاہے، کہ ان کی آنکھیں چار نہ ہوں۔ مگر غیر ممکن۔ جدھر دیکھو، ان کا میلہ سا لگا ہوا ہے۔ اجی اکثر تو خط لکھانے کے بہانے سے گھروں میں آجاتی ہیں۔ اور خواہ مخواہ گھر والیوں کو جلاتی ہیں۔"

معلوم نہیں اس خط میں مجھ سے کون سی غلطی ہو گئی، کہ تیسرے ہی دن اہلیہ محترمہ ایک بوڑھے کہار کے ساتھ میرا پتہ پوچھتی ہوئی اپنے تینوں بچوں کو لئے ایک بلائے بے درماں کی طرح وارد ہو گئیں۔

میں نے بدحواس ہوکر پوچھا "کیوں خیریت تو ہے؟"

اہلیہ نے چادر اتارتے ہوئے کہا: "گھر میں کوئی چڑیل بیٹھی تو نہیں ہے؟ یہاں کسی نے قدم رکھا، تو ناک ہی کاٹ لوں گی۔ ہاں، جو تمہاری شہ نہ ہو۔"

اچھا تو اب عقدہ کھلا، میں نے سر پیٹ لیا، کیا جانتا تھا، کہ اپنا طمانچہ اپنے ہی منہ پر پڑے گا۔

ستی

مُلیا کو دیکھتے ہوئے اس کا شوہر کلّو کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر کیا وجہ ہے، کہ مُلیا خوش و خرّم ہے۔ اور کلّو مغموم اور متفکر؟ ملیا کو کوڑی ملی ہے۔ اسے دوسرا کون پوچھے گا۔ کلّو کو جواہر ملا ہے۔ اس کے سینکڑوں خریدار ہو سکتے ہیں۔ خاص کر اسے اپنے چچازاد بھائی راجہ سے بڑا اندیشہ تھا۔ راجہ خوب صورت ہے۔ اور رنگین مزاج۔ باتیں کرنے میں چالاک ہے اور عورتوں کو رجھانا خوب جانتا ہے۔ اس لئے کلّو مُلیا کو باہر نہیں نکلنے دیتا۔ اس پر کسی کی نظر بھی پڑ جائے۔ یہ وہ برداشت نہیں کر سکتا، وہ اب شب و روز محنت کرتا ہے۔ تاکہ مُلیا کو کسی بات کی تکلیف نہ ہو۔ اُسے نہ جانے کس جزائے خیر میں یہ عورت ملی ہے۔ اور وہ اس پر دل و جان قربان کر دینا چاہتا ہے۔ ملیا کا کبھی سر بھی دُکھتا ہے۔ تو اس کی جان نکل جاتی ہے۔ ملیا کا بھی یہی حال ہے کہ جب تک کلو گھر واپس نہیں آتا۔ ماہئِ بے آب بنی رہتی ہے۔

گاؤں میں کتنے ہی نوجوان ہیں۔ جو ملیا سے چھیڑ کیا کرتے ہیں۔ مگر اس کی نظر میں بدصورت کلو دنیا کے ہر انسان سے بہتر ہے۔

ایک دن راجہ نے کہا۔ "بھابی، بھیا تمہارے قابل نہیں ہیں۔"

ملیا نے فوراً جواب دیا۔ "قسمت میں تو وہی لکھے تھے۔ تمہیں کیونکر پاتی؟"

راجہ نے دل میں سوچا۔ اب مار لیا۔ بولا۔ "بھگوان نے بھی تو غلطی کی ہے۔"

ملیا مسکرا کر بولی۔ "اپنی غلطی کو وہی ٹھیک کرے گا۔"

راجہ خوش ہو گیا۔

۲

تیج کے دن کلو ملیا کے لئے لٹھے کی ساڑھی لایا۔ جی تو چاہتا تھا، کہ کوئی عمدہ سی ساڑھی لے۔ مگر روپے نہ تھے۔ اور بزاز نے اُدھار نہ مانا۔

راجہ بھی اسی دن قسمت آزمائی کرنا چاہتا تھا۔ ایک عمدہ سی چندری لا کر ملیا کی نذر کی۔

ملیا نے کہا۔ "میرے لئے تو ساڑھی آ گئی ہے۔"

راجہ بولا۔ "میں نے دیکھی ہے جبھی تو اسے لایا ہوں۔ وہ تمہارے لائق نہیں۔ بھیا کو کفایت ہی سوجھتی ہے، تو ایسی باتوں میں۔"

ملیا نے ترچھی آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ "تم سمجھا کیوں نہیں دیتے؟"

راجہ پر ایک پیالے کا نشہ چڑھ گیا۔ بولا۔ "بڈھا طوطا کہیں پڑھتا ہے؟"

ملیا۔ "مجھے تو لٹھے کی ساڑھی پسند ہے۔"

راجہ۔ "ذرا یہ چندری پہن کر تو دیکھو۔ کیسی کھلتی ہے۔"

ملیا۔ "جو لٹھا پہنا کر خوش ہوتا ہے۔ وہ چندری پہننے سے خوش نہ ہوگا۔ اسے چندری پسند ہوتی، تو وہ چندری ہی لاتا؟"

راجہ۔ "انہیں دکھلانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

ملیانے تعجب سے کہا۔ "تو کیا میں ان سے بغیر پوچھے لے لوں گی؟"

راجہ۔ "اس میں پوچھنے کی کون سی بات ہے؟ جب وہ کام پر چلے جائیں۔ تب پہن لینا۔ میں بھی دیکھ لوں گا۔"

ملیا قہقہہ مار کر ہنستی ہوئی بولی۔ "یہ نہ ہوگا دیورجی، کہیں دیکھ لیں تو میری شامت ہی آجائے۔ لسے تم لیتے جاؤ۔"

راجہ نے بضد ہو کر کہا۔ "ایسے نہ لوں گی بھابی تو میں زہر کھا کر سو رہوں گا۔"

ملیا نے ساڑھی اُٹھا کر طاق پر رکھ دی، اور بولی۔ "لو، اب تو خوش ہو؟"

راجہ نے انگلی پکڑی۔ "ابھی تو بھیا نہیں ہیں، ذرا پہن لو۔"

ملیانے اندر جا کر چندری پہن لی۔ اور پھول کی طرح مہکتی دمکتی باہر آئی۔

راجہ نے بازو پکڑنے کو ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "ایسا جی چاہتا ہے، کہ تمہیں لے کر کہیں بھاگ جاؤں۔"

ملیانے اسی سرور انگیز انداز سے جواب دیا۔ "جانتے ہو تمہارے بھیا کا کیا حال ہوگا؟"

یہ کہہ کر ملیانے کواڑ بند کر لئے۔

راجہ کو ایسا معلوم ہوا، گویا سامنے سے پروسی ہوئی تھالی اُٹھا لی گئی۔

۳

ملیا کا جی تو یہی چاہتا تھا، کہ چندری کلو کو دکھا دے۔ مگر نتیجہ سوچ کر ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس نے چندری رکھ کیوں لی؟ اسے اپنے اوپر غصہ آرہا ہے۔ لیکن راجہ کو کتنا رنج ہوتا؟ کیا ہوا اس کی چندری ذرا دیر پہن لینے سے اس کا دل تو رہ گیا۔ لیکن اس کے دل کی ساکت گہرائیوں میں یہ ایک کیڑا جیسے اسے متھ رہا تھا۔ اس نے کیوں چندری رکھ لی؟ کیا یہ کلو کے ساتھ دغا نہیں تھی؟ اس کا دل اس خیال سے پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے دل کو سمجھایا۔ دغا کیوں ہوئی۔ اس میں دغا کی کون سی بات ہے؟ کیا وہ راجہ سے بولی؟ ذرا سا ہنس دینے سے اگر کسی کا دل خوش ہو جاتا ہے، تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟

کلو نے پوچھا۔ "آج راجہ کیا کرنے آیا تھا؟"

ملیا کا بدن کانپنے لگا۔ بہانہ کر کے بولی۔ "تمباکو مانگنے آئے تھے۔"

کلو نے ناک سکوڑ کر کہا۔ "اسے اندر مت آنے دیا کرو۔ اچھا آدمی نہیں ہے۔"

ملیا۔ "میں نے کہہ دیا۔ تمباکو نہیں ہے، تو چلے گئے۔"

کلو نے کسی قدر تیز ہو کر کہا۔ "کیوں جھوٹ بولتی ہو؟ وہ تمباکو مانگنے نہیں آیا۔"

ملیا۔ "تو اور یہاں کیا کرنے آئے تھے؟"

کلو۔ "اور کسی کام سے آیا ہو۔ مگر تمباکو مانگنے نہیں آیا۔ وہ جانتا تھا، میرے گھر میں تمباکو نہیں ہے۔ میں تمباکو کے لئے خود ہی اس کے گھر گیا تھا۔"

ملیا کے بدن میں کاٹو تو خون نہیں۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ سر جھکا کر

بولی ۔" میں کسی کے من کا حال کیا جانوں ؟"

آج تیج کا برت تھا ۔ ملیا پوجا کا سامان کر رہی تھی ۔ پر اس طرح گویا اس کے دل میں ذرا بھی اعتقاد ' ذرا بھی شوق نہیں ہے ۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا ہے ۔ گویا اس کے منہ میں کالکھ پُت گئی ہے ۔ اور اب وہ کلّو کی آنکھوں سے گر گئی ہے ۔ اسے اپنی زندگی ویران نظر آتی ہے ۔

سوچنے لگی ۔ بھگوان نے مجھے یہ حُسن کیوں دیا ؟ یہ روپ نہ ہوتا ، تو راجہ کیوں میرے پیچھے پڑتا ۔ اور کیوں آج میری یہ حالت ہوتی ۔ میں کالی اور بدصورت ہو کر اس سے کہیں زیادہ سکھی ہوتی ۔ تب تو دل اتنا چنچل نہ ہوتا ۔ جنہیں روپ کی کمائی کھانی ہو ' وہ روپ کو لے جائیں ۔ یہاں اس نے زندگی برباد کر دی ۔

نہ جانے کب اسے نیند آ گئی ۔ دیکھتی ہے ' کلو مر گیا ۔ اور راجہ گھر میں گھس کر اسے پکڑنا چاہتا ہے ۔ اسی وقت ایک بڑھی عورت نہ جانے کدھر سے آ کر اُسے گود میں لے لیتی ہے ۔ اور کہتی ہے ۔" تو نے کلّو کو کیوں مار ڈالا ؟"

ملیا رو رو کر جواب دیتی ہے ۔" ماں میں نے انہیں نہیں مارا ۔"

بڑھیا جواب میں کہتی ہے :" ہاں تو نے انہیں چھری کٹار سے نہیں مارا ۔ لیکن تیری دغا کٹار سے زیادہ قاتل تھی ۔"

مُلیا رو دی ۔

ملیا نے چونک کر آنکھیں کھولیں ۔ تو سامنے صحن میں کلّو سو رہا تھا ۔ وہ دوڑی ہوئی اس کے پاس گئی ۔ اور اس کی چھاتی پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ۔

کلو نے گھبرا کر پوچھا۔ "کون ہے؟ مولا کیوں روتی ہو؟ کیا ڈر گئیں؟ میں تو جاگ ہی رہا ہوں۔"

ملیا نے سسکی لے کر کہا۔ "مجھ سے آج ایک خطا ہو گئی۔ اسے معاف کر دو۔"

کلو اُٹھ بیٹھا۔ اور بولا۔ "کیا بات ہے؟ کہو تو کیوں روتی ہو؟"

ملیا۔ "راجہ تمبا کو مانگنے نہیں آیا تھا۔ میں نے تم سے جھوٹ کہا تھا۔"

کلو ہنس کر بولا۔ "وہ تو میں پہلے ہی سمجھ رہا تھا۔"

ملیا۔ "وہ میرے لئے ایک چندری لائے تھے۔"

"تم نے لوٹا دی نہ؟"

ملیا کانپتی ہوئی بولی۔ "میں نے لے لی! کہتے تھے، میں زہر کھا لوں گا۔"

کلو لمبی سانس لے کر چارپائی پر گر پڑا۔ اور بولا۔ "روپ تو میرے بس کی بات نہیں ہے۔ بھگوان نے بدصورت بنا دیا، تو سُندر کہاں سے ہو جاؤں؟"

کلو نے اگر ملیا کو کھولتے ہوئے تیل میں ڈال دیا ہوتا، تو بھی اسے اتنا درد نہ ہوتا۔

۴

کلو اس دن سے کچھ کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ زندگی میں نہ وہ شوق رہا نہ مزا۔ ہنسنا بولنا گویا بھول گیا۔ ملیا نے اس کے ساتھ جتنی دغا کی تھی۔ اس سے کہیں زیادہ اس نے سمجھ لیا۔ اور یہی شبہہ اس کے دل میں سرطان کی طرح چمٹ گیا۔ وہ گھر اب اس کے لئے صرف اُٹھنے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ اور ملیا صرف کھانا پکانے والی مشین، حظِ نفس کے لئے وہ کبھی کبھی تاڑی خانے چلا جاتا، یا چرس کے دم لگاتا۔

ملیا اس کی یہ حالت دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتی تھی۔ وہ اس شبہہ کو اس کے دل سے نکال دینا چاہتی تھی۔ اس لئے دل و جان سے اس کی خدمت کرتی۔ اسے خوش رکھنے کی مسلسل کوشش کرتی رہتی۔ مگر وہ جتنا ہی اسے کھینچنے کی کوشش کرتی۔ اتنا ہی دور وہ اس سے کھنچتا تھا۔ گویا کوئی کانٹے میں پھنسی ہوئی مچھلی ہو۔ غنیمت یہ ہوئی، کہ راجہ جس انگریز کے یہاں نوکر تھا۔ اس کا تبادلہ ہو گیا۔ اور وہ اس کے ساتھ چلا گیا۔ نہیں تو دونوں بھائیوں میں سے کسی نہ کسی کا ضرور خون ہو جاتا۔ اسی طرح سال بھر اور گذر گیا۔

ایک دن کلو رات کو گھر لوٹا۔ تو اس کو بخار تھا۔ دوسرے دن اس کے جسم میں دانے نکل آئے۔ ملیا نے خیال کیا۔ ماتا ہے۔ مان منوتی کرنے لگی مگر چار پانچ دن ہی میں دانے بڑھ کر آبلے ہو گئے۔ اور معلوم ہوا یہ ماتا نہیں گرمی ہے۔ کلو کی خرمستی یہ رنگ لائی تھی۔

بیماری سیلاب کی رفتار سے بڑھنے لگی۔ آبلوں میں مواد پڑ گیا۔ اور ان میں سے ایسی بدبو نکلنے لگی، کہ پاس بیٹھتے ناک پھٹتی تھی۔ دیہات میں جس طرح کا علاج ہو سکتا تھا، وہ ملیا کرتی تھی۔ مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اور کلو کی حالت روز بروز بگڑتی جاتی تھی۔ علاج کے لئے پیسے کی بھی ضرورت تھی، اور ملیا کو اب محنت مزدوری کرنی پڑتی تھی۔ کلو ادھر اپنے کئے کا پھل بھوگ رہا تھا۔ ملیا ادھر دوا دارو میں مری جا رہی تھی۔ اگر کچھ صبر تھا، تو یہی، کہ کلو کا اندیشہ اور شبہہ اس کی اس خدمت گذاری سے دور ہوتا جاتا تھا۔ اسے اب یقین ہو رہا تھا، کہ ملیا اب بھی اسی کی ہے۔ وہ اگر کسی طرح اچھا ہو جاتا، تو پھر اسے دل میں رکھتا۔ اور اس کی

پرستش کرتا۔

صبح کا سہانا وقت تھا، ملیا نے کلو کا ہاتھ منہ دُھلا کر دوا پلائی۔ اور کھڑی پنکھا جھل رہی تھی، کہ کلو نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا: "مولا، میں نے پچھلے جنم میں کوئی بھاری تپ کیا تھا۔ کہ تم مجھے مل گئیں۔ اگر تمہاری جگہ مجھے دُنیا کا راج بھی ملے، تو نہ لوں۔"

ملیا نے دونوں ہاتھوں سے اس کا منہ بند کر لیا۔ اور بولی: "اگر اس طرح کی باتیں کروگے، تو میں رونے لگوں گی۔ میں بڑی قسمت ور تھی، کہ تم جیسا شوہر پایا۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھ شوہر کے گلے میں ڈال دئے۔ اور بولی: "بھگوان نے مجھے میرے پاپوں کا بدلہ دیا ہے۔"

کلو نے پُر خلوص نظروں سے دیکھ کر پوچھا: "سچ کہو مولا۔ راجہ اور تم میں کیا معاملہ تھا؟"

ملیا نے حیرت میں آ کر کہا: "میرے اور ان میں اگر کوئی اور معاملہ ہو تو بھگوان میری اس سے بُری حالت کریں۔ اس نے مجھے چندری دی تھی، وہ میں نے لے لی۔ پھر میں نے اُسے آگ میں جلا دیا۔ تب سے میں اس کے ساتھ نہیں بولی۔"

کلو نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا: "میں نے کچھ اور ہی سمجھ رکھا تھا۔ نہ جانے میری سمجھ کہاں غائب ہو گئی تھی۔ تمہیں پاپ لگا کر خود ہی پاپ میں پھنس گیا۔ اور اب اس کا پھل بھوگ رہا ہوں۔"

اس نے رو رو کر اپنی بے راہ روی کا پردہ فاش کرنا شروع کیا۔ اور ملیا آنسوؤں کی لڑیاں بہا بہا کر سننے لگی۔ اگر شوہر کی فکر نہ ہوتی، تو اس نے زہر کھا لیا ہوتا۔

کئی مہینے بعد راجہ چھٹی لے کر آیا۔ اور کلّو کی مہلک بیماری کا حال سُنا، تو بہت خوش ہوا۔ تیمارداری کے بہانے سے کلّو کے گھر آنے جانے لگا۔ کلّو اسے دیکھ کر منہ پھیر لیتا۔ لیکن وہ دن میں دو چار بار پہنچ ہی جاتا تھا۔

ایک دن ملیا کھانا پکا رہی تھی۔ کہ راجہ نے رسوئی خانہ کے دروازے پر آ کر کہا۔

"بھابی، کیا اب بھی مجھ پر مہربانی نہ ہو گی؟ کتنی بے رحم ہو تم۔ کئی دن سے میں تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔ مگر تم مجھ سے بھاگتی پھرتی ہو۔ بھیا اب اچھے نہ ہوں گے۔ انہیں گرمی ہو گئی ہے۔ ان کے ساتھ کیوں اپنی زندگی خراب کر رہی ہو؟ تمہارا گلاب سا بدن سوکھ گیا ہے۔ میرے ساتھ چلو۔ کچھ زندگی کے مزے اُڑائیں۔ یہ جوانی بہت دن نہ رہے گی۔ یہ دیکھو، تمہارے لئے ایک کرن پھول لایا ہوں۔ ذرا پہن کر مجھے دکھا دو۔"

اس نے کرن پھول ملیا کی طرف بڑھا دیا۔ ملیا نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ چولھے کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

"لالہ تمہارے پیروں پڑتی ہوں مجھے مت چھیڑو۔ یہ ساری مصیبت تمہاری ہی لائی ہوئی ہے۔ تمہیں میرے دشمن ہو۔ پھر بھی تمہیں شرم معلوم نہیں ہوتی۔ کہتے ہو بھیا اب کس کام کے ہیں؟ مجھے تو اب وہ پہلے سے کہیں زیادہ اچھے لگتے ہیں۔ تب میں نہ ہوتی، تو وہ دوسری سگائی کر لیتے۔ اپنے ہاتھوں ٹھوکر کھاتے۔ آج میں ہی ان کا سہارا ہوں۔ وہ میرے سہارے زندہ ہیں۔ اگر اس مصیبت میں میں ان سے دغا کروں، تو مجھ سے بڑھ کر پاپی اور کون ہو گا؟ اور جب میں جانتی ہوں، کہ اس مصیبت کا کارن بھی میں ہی ہوں۔"

راجہ نے ہنس کر کہا۔ "یہ تو وہی ہوا۔ جیسے کسی کی دال گر گئی تو اس نے کہا۔ مجھے تو سوکھی ہی اچھی لگتی ہے۔"

ملیا نے نفرت انگیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "تم ان کے پاؤں کی دھول بھی نہیں ہو، کیسے گیا ہو، اجلے کپڑے اور چکنے مکھڑے سے کوئی آدمی نہیں ہو جاتا میری آنکھوں میں تو اب ان کے سامنے کوئی جچتا نہیں۔"

کلو نے پکارا۔ "ملیا تھوڑا پانی دے۔"

ملیا پانی لے کر دوڑی۔ چلتے چلتے کرن پھول ایسا ٹھکرایا، کہ صحن میں جا کر گرا۔ راجہ نے جلدی سے کرن پھول اُٹھا لیا۔ اور غصہ میں چلا گیا۔

۵

کلو کی بیماری روز بروز بڑھتی گئی۔ معقول علاج ہوتا، تو شاید اچھا ہو جاتا۔ مگر اکیلی ملیا کیا کیا کرتی۔ غریبی میں بیماری کوڑھ میں کھاج ہے۔

آخر ایک دن ملک الموت کا پیغام آ ہی پہنچا۔ ملیا گھر کا کام کاج کر کے آئی، تو دیکھا، کلو کی سانس زور زور سے چل رہی ہے، گھبرا کر بولی۔

"کیسی طبیعت ہے تمہاری؟"

کلو نے آنکھوں میں آنسو بھر کر ہاتھ جوڑے۔ اور سر نیچا کر لیا۔ یہ دم واپسیں تھا۔

ملیا اس کے سینے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ اور ہذیان کے عالم میں بولی۔

"تم سے اتنا بھی نہ دیکھا گیا بھگوان۔ اور اس پر دیالو کہلاتے ہو۔ اسی لئے مجھے پیدا کیا تھا، یہی تماشا دکھلانے کے لئے؟ ہائے میرے سرتاج، تم تو اتنے بے درد نہ تھے۔ مجھے اکیلی چھوڑ کر چلے جا رہے ہو، ہائے اب کون ملیا کہہ کر پکارے گا۔ اب کس کے لئے کنوئیں سے پانی بھر کر لاؤں گی؟

کسے بٹھا کر کھلاؤں گی؟ کسے پنکھا ڈلاؤں گی؟ بھگوان سب کچھ لیا، تو مجھے کیوں نہیں لے چلتے؟"

سارا گاؤں جمع ہو گیا۔ سبھی سمجھا رہے تھے۔ ملیا کو صبر نہ ہوتا تھا۔ یہ سب میری وجہ سے ہوا۔ یہ بات اسے نہ بھولتی تھی۔

۶

کلو کو مرے چھ مہینے ہو گئے۔ ملیا کماتی ہے، کھاتی ہے۔ اور اپنے گھر میں پڑی رہتی ہے۔ دن بھر کام کاج سے فرصت نہیں ملتی۔ ہاں رات کو اکیلے میں بیٹھ کر کچھ دیر رو لیا کرتی ہے۔

ادھر راجہ کی عورت بھی مر گئی۔ مگر دو ہی چار دن کے بعد وہ پھر چھیلا بنا گھومنے لگا۔ اب اور بھی چھوٹا سانڈ ہو گیا۔ پہلے عورت سے لڑائی ہو جانے کا خوف تھا۔ اب وہ بھی نہیں رہا۔ اب کے نوکری سے لوٹا، تو سیدھا ملیا کے گھر پہنچا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد بولا۔

"بھابی، اب تو میری امید پوری کرو گی یا ابھی کچھ اور بھی باقی ہے؟ اب تو بھیا بھی نہیں رہے۔ اور ادھر میرے گھر والی بھی مر گئی۔ میں نے تو اس کا غم بھلا دیا۔ تم کب تک بھیا کے نام کو روتی رہو گی؟"

ملیا نے نفرت سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "بھیا نہیں رہے تو کیا ہوا؟ بھیا کی یاد تو ہے۔ ان کی محبت تو ہے۔ ان کی صورت تو دل میں ہے۔ ان کی باتیں تو کانوں میں ہیں۔ میرے لئے وہ اب بھی ویسے ہی جیتے جاگتے ہیں۔ میں اب بھی انہیں ویسا ہی بیٹھا ہوا دیکھتی ہوں پہلے تو بدن کا بیچ تھا، اب تو وہ مجھ سے اور بھی قریب ہو گئے ہیں۔ اور جیوں جیوں دن گذریں گے۔ اور بھی قریب ہوتے جائیں گے۔ بھرے پُرے گھر میں دانے کی قدر کون کرتا

ہے - جب گھر خالی ہو جاتا ہے - تب معلوم ہوتا ہے، کہ دانہ کیا چیز ہے؟ پیسے والے پیسے کی قدر کیا جانیں؟ پیسے کی قدر تب ہوتی ہے - جب ہاتھ خالی ہوتا ہے - اس وقت آدمی ایک ایک کوڑی کو دانت سے اُٹھاتا ہے - تمہیں بھگوان نے دل ہی نہیں دیا - تم کیا جانو، محبت کیا چیز ہے؟ گھر والی کو مرے ابھی چھ مہینے بھی نہیں ہوئے - اور تم سانڈ بنے پھرتے ہو - تم مر گئے ہوتے تو اسی طرح وہ بھی اب تک کسی کے پاس چلی گئی ہوتی - مگر جانتی ہوں - میں مر جاتی تو میرا سرتاج عمر بھر میرے نام کو رویا کرتا - ایسے ہی مردوں کی عورتیں ان پر جان دیتی ہیں - تم جیسے شہدوں کی قسمت میں دوسروں کا جھوٹا کھانا ہی بدا ہے - کھاؤ، مگر خبردار! آج سے میرے گھر میں پاؤں مت رکھنا - نہیں تو جان سے ہاتھ دھوؤ گے - نکل جاؤ میرے گھر سے!"

اس کے چہرے پر اتنا جلال اور لہجہ میں اتنی تندی تھی - کہ راجہ کو زبان کھولنے کی ہمّت نہ ہوئی - چپکے سے نکل گیا -

طلوعِ محبت

بھوندو پسینہ میں شرابور لکڑیوں کا گٹھا سر پر لئے آیا۔ اور اسے زمین پر پٹک کر بنتی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ گویا زبانِ حال سے پوچھ رہا تھا۔ کیا ابھی تک تیرا مزاج درست نہیں ہوا؟"

شام ہو گئی تھی۔ پھر بھی لو چلتی تھی، اور آسمان پر گرد و غبار چھایا ہوا تھا۔ ساری قدرت دق کے مریض کی طرح نیم جان ہو رہی تھی۔ بھوندو صبح گھر سے نکلا تھا۔ دوپہر درخت کے سایہ تلے بسر کی تھی۔ اور سمجھا تھا اس تپسیا سے دیوی جی کا منہ ٹھیک ہو گیا ہوگا۔ لیکن آ کر دیکھا، تو وہ ابھی تک تنی بیٹھی تھی۔

کا

سیں۔

بھوندو نے سلسلہ کلام شروع کرنے کی غرض سے کہا۔ "لا ایک پانی کا لوٹا دے دے۔ بڑی پیاس لگی ہے۔ مر گیا سارے دن میں، بجار جاؤں گا، تو تین آنے سے بیشی نہ ملیں گے"۔

بنٹی نے سرکی کے اندر بیٹھے بیٹھے کہا۔ "دھرم بھی بولوٹ گے، اور پیسے بھی، منہ دھو رکھو!"

بھوندو نے بھنویں سکوڑ کر جواب دیا۔ "کیا دھرم دھرم بکتی ہے، دھرم کرنا ہنسی کھیل نہیں۔ دھرم وہ کرتا ہے، جس پر بھگوان کی مہربانی ہو۔ ہم دھرم کھاک کریں گے۔ پیٹ بھرنے کو چنا چبینا تو ملتا نہیں۔ دھرم کیا کریں گے؟"

بنٹی نے اپنا وار اوچھا پڑتے دیکھ کر چوٹ پر چوٹ کی۔

دنیا میں کچھ ایسے دھرماتما بھی ہیں، جو اپنا پیٹ چاہے نہ بھر سکیں۔ مگر پڑوسیوں کی دعوت کرتے پھرتے ہیں۔ ورنہ سارے دن بن بن کی لکڑیاں نہ کاٹتے پھرتے۔ ایسے دھرماتما لوگوں کو جورو رکھنے کی کیوں سوجھتی ہے۔ یہی میری سمجھ میں نہیں آتا۔ دھرم چھکڑا کیا اکیلے نہیں چلتا؟"

بھوندو اس چوٹ سے تلملا اُٹھا۔ اس کی رگیں تن گئیں۔ پیشانی پر بل پڑ گئے۔ بنٹی کا منہ وہ ایک ڈپٹ میں بند کر سکتا تھا۔ مگر اس نے یہ نہ سیکھا تھا۔ جس کی طاقت کی سارے کنجڑوں پر دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ جو تن تنہا سو پچاس جوانوں کا نشہ اُتار سکتا تھا۔ وہ ایک کمزور عورت کے سامنے منہ نہ کھول سکا۔ دبی زبان سے بولا۔

"جورو دھرم گنولنے کے لئے نہیں لائی جاتی۔ دھرم کمانے کے لئے لائی جاتی ہے۔"

یہ دونوں کنجڑ خاوند بیوی تین دن سے اور کئی کنجڑوں کے ساتھ اس باغ میں اُترے ہوئے تھے۔ سارے باغ میں سرکیاں ہی سرکیاں دکھائی دیتی تھیں۔ ان تین ہاتھ چوڑی اور چار ہاتھ لمبی سرکیوں کے اندر ایک گھرانہ زندگی کی تمام مصروفیتوں، تمام بے نوائیوں کے ساتھ گذر اوقات کر رہا تھا۔ ایک طرف چکی تھی۔ ایک طرف باورچی خانہ کی اشیاء، ایک طرف اناج کے مٹکے، دروازہ پر ایک کھٹولی بچوں کے لئے پڑی تھی۔ ہر ایک گھر کے ساتھ دو دو بھینسے یا گدھے تھے۔ جب ڈیرا کوچ ہوتا تھا، تو سارا ساز و سامان ان گدھوں یا بھینسوں پر لاد دیا جاتا تھا۔ یہی ان کنجڑوں کی زندگی تھی۔ ساری بستی ایک ساتھ چلتی تھی، ایک ساتھ ٹھہرتی تھی۔ ان کی دنیا اسی بستی کے اندر تھی۔ آپس ہی میں شادی بیاہ، لین دین، جھگڑے قضئے ہوتے رہتے تھے۔ اس دنیا کے باہر سارا جہان ان کے لئے شکار گاہ تھا۔ ان کے کسی علاقہ میں پہنچتے ہی وہاں کی پولیس آ کر انہیں نگرانی میں لے لیتی تھی۔ پڑاؤ کے ارد گرد چوکیداروں کا پہرہ لگ جاتا تھا۔ عورت یا مرد کسی گاؤں میں جاتے۔ تو پولیس کے آدمی ان کے ساتھ ہو لیتے۔ رات کو ان کی حاضری لی جاتی۔ پھر بھی گرد و نواح کے لوگ سہمے ہوئے تھے۔ کیونکہ کنجڑ لوگ اکثر گھروں میں گھس کر جو چیز چاہتے، اُٹھا لیتے۔ اور ان کے ہاتھ میں جا کر کوئی شے لوٹ نہ سکتی تھی۔ رات میں یہ لوگ اکثر چوری کرنے نکل جاتے۔ چوکیدار اُن سے ڈرتے تھے۔ کیونکہ یہ لوگ خونخوار تھے ذرا سی بات پر لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے۔ سختی کرنے میں جان کا خطرہ تھا۔ کیونکہ کنجڑ لوگ بھی ایک حد تک ہی پولیس کا دباؤ مانتے تھیں۔

ساری بستی میں بھوندو ہی ایک ایسا شخص تھا۔ جو اپنی محنت کی کمائی کھاتا تھا۔ مگر اس لئے نہیں، کہ وہ پولیس والوں سے خائف تھا۔ بلکہ اس لئے کہ اس کی بہادری یہ گوارا نہ کر سکتی تھی، کہ وہ ناجائز طریقہ سے اپنی کسی ضرورت کو پورا کرے۔

بنٹی کو اپنے شوہر کی یہ پاکدامنی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اس کی بہنیں نئی نئی چوڑیاں اور نئے نئے زیور پہنتیں۔ تو بنٹی اپنے شوہر کی بزدلی پر کڑھتی تھی۔ اس بات پر دونوں میں کئی مرتبہ جھگڑے ہو چکے تھے۔ لیکن بھوندو اپنی عاقبت بگاڑنے کو تیار نہ ہوتا تھا۔ آج بھی صبح یہی سوال در پیش تھا۔ اور بھوندو لکڑی کاٹنے جنگل نکل گیا تھا۔ کچھ مل جاتا، تو بنٹی کی اشک شوئی ہو جاتی۔ مگر آج سوائے لکڑی کے اور کوئی شے نہ ملی۔ نہ کوئی جانور نہ خس، نہ جڑی بوٹی۔

بنٹی نے کہا۔ "جن سے کچھ نہیں ہو سکتا، وہی دھرماتما بن جاتے ہیں۔ رانڈ اپنے مانڈ ہی میں خوش ہے۔"

بھوندو نے کہا۔ "تو میں نکھٹو ہوں؟"

بنٹی نے اس سوال کا سیدھا جواب نہ دیا۔ "میں کیا جانوں۔ تم کیا ہو۔ میں تو یہ جانتی ہوں، کہ یہاں دھیلے دھیلے کی چیز کے لئے ترسنا پڑتا ہے۔ یہاں جتنی عورتیں ہیں۔ سب کھاتی ہیں۔ ہنستی کھیلتی ہیں۔ پہنتی اوڑھتی ہیں۔ کیا میرے ہی دل نہیں ہے۔ تمہارے ساتھ بیاہ کر کے جندگی کھراب ہو گئی۔"

بھوندو نے ایک لمحہ سوچ کر کہا۔ "جانتی ہے، پکڑا گیا، تو تین سال سے کم کی سجا نہ ہو گی۔"

بنٹی پر اثر نہ ہوا۔ بولی۔ "جب اور لوگ نہیں پکڑے جاتے، تو تم ہی کیوں پکڑے جاؤ گے؟"

بھوندو۔ "اور لوگ پولیس کی کھوسامدیں کرتے ہیں۔ چوکیداروں کے پاؤں سہلاتے ہیں۔ تو چاہتی ہے۔ میں بھی یہ کرم کروں؟"

بنٹی نے اپنی ضد نہ چھوڑی۔ بولی: "میں تمہارے ساتھ ستی ہونے نہیں آئی۔ پھر تمہارے چھرے گنڈاسے سے کوئی کہاں تک ڈرے۔ جانور کو بھی جب گھاس چارہ نہیں ملتا۔ تو رسہ تڑا کر کسی کھیت میں گھستا ہے۔ میں تو آدمی ہوں۔"

بھوندو نے اس کا جواب نہ دیا۔ اس کی بیوی کوئی دوسرا گھر کر لے گی۔ یہ خیال بھی اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ آج بنٹی نے پہلی مرتبہ یہ دھمکی دی۔ اب تک بھوندو اس کی طرف سے بے فکر تھا۔ اب یہ نیا خطرہ اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنی زندگی میں ایسا روز سیاہ کبھی نہ آنے دے گا۔ اس کے لیے وہ سب کچھ کر گذرے گا۔ بھوندو کی نگاہوں میں بنٹی کی وہ عزت نہیں رہی۔ وہ اعتماد نہیں رہا مضبوط دیوار کو ٹکا دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جب دیوار ہلنے لگتی ہے۔ تو ہمیں اس کے سنبھالنے کی فکر ہوتی ہے۔ آج بھوندو کو اپنے گھر کی دیوار ہلتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ آج تک بنٹی اس کی اپنی تھی۔ وہ جس طرح اپنی طرف سے بے پروا تھا۔ اس کی طرف سے بھی بے فکر تھا۔ وہ جس طرح خود رہتا تھا۔ اسی طرح اس کو رکھتا تھا۔ جو خود کھاتا تھا۔ وہی اسے کھلاتا تھا۔ اس کی کوئی خاص فکر نہ تھی۔ پر آج اسے معلوم ہوا، کہ وہ اس کی اپنی نہیں۔ اب اسے اس کی خاص طور پر دلجوئی کرنا ہو گی۔

آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ اس نے دیکھا، کہ اس کا گدھا چر کر چپ چاپ سر جھکائے چلا آ رہا تھا۔ بھوندو نے کبھی اس کے کھانے پینے کی طرف دھیان نہ دیا۔ آج اس نے باہر آ کر اسے پچکارا۔ اس کی پیٹھ سہلائی، اور اسے پانی پلانے کے لئے ڈول اور رسّی لے کر کنوئیں پر چلا گیا۔

۳

اس کے دوسرے ہی دن گاؤں کے ایک امیر ٹھاکر کے گھر چوری ہو گئی۔ اس رات بھوندو اپنے ڈیرے پر نہ تھا۔ بنٹی نے چوکیدار سے کہا۔ "کل جنگل سے نہیں لوٹا!"

صبح کے وقت بھوندو آ پہنچا۔ اس کی کمر میں روپوں کی تھیلی تھی۔ کچھ سونے کے گہنے تھے۔ بنٹی نے گہنے ایک درخت کے نیچے گاڑ دئے۔ روپوں کی کیا پہچان ہو سکتی تھی۔

بھوندو نے پوچھا۔ "اگر کوئی پوچھے۔ اتنے سارے روپے کہاں سے ملے، تو کیا کہوگی؟"

بنٹی نے آنکھیں نچا کر کہا۔ "کہہ دوں گی۔ کیوں بتاؤں۔ دنیا کماتی ہے۔ تو کسی کو حساب دینے جاتی ہے۔ ہم اپنا حساب کیوں دیں؟"

بھوندو نے گردن ہلا کر کہا۔

"یہ کہنے سے گلا نہ چھوٹے گا بنٹی۔ تو کہہ دینا۔ میں کئی مہینے سے تین تین چار چار روپے مہینہ بچاتی رہی ہوں۔ ہمارا خرچ ہی کون بڑا لمبا ہے؟"

دونوں نے مل کر کئی جواب سوچ لئے۔ جڑی بوٹیاں بیچتے ہیں۔ ایک ایک جڑی کے لئے کئی کئی روپے مل جاتے ہیں۔ کھس، گھاس جانوروں کی کھالیں سب بیچتے ہیں۔

اس طرف سے بے فکر ہو کر دونوں بازار چلے۔ بنیٔ نے اپنے لئے کئی قسم کے کپڑے، چوڑیاں، بُندے، سیندور، پان، تمباکو، تیل اور مٹھائی لی۔ پھر دونوں شراب کی دوکان پر گئے۔ خوب شراب پی۔ اور دو بوتلیں رات کے لئے لے کر گھومتے پھرتے۔ گاتے بجاتے، گھڑی رات گئے ڈیرہ پر آئے۔ بنیٔ کے پاؤں آج زمین پر نہ پڑتے تھے۔ آنے کے ساتھ ہی بن ٹھن کر پڑوسنوں کو اپنی چھب دکھانے چلی گئی۔

جب وہ لوٹ کر اپنے گھر گئی۔ اور کھانا پکانے لگی۔ تو پڑوسنوں نے تنقید کرنی شروع کر دی۔

"کہیں گہرا ہاتھ مارا ہے"

"بڑا دھرماتما بنا پھرتا تھا"

"بگلا بھگت ہے"

"بنیٔ تو جیسے آج ہوا میں اُڑ رہی ہے"

"آج بھوندو کی خاطر ہو رہی ہے، ورنہ کبھی ایک لٹیا پانی دینے بھی نہ اُٹھتی تھی"

اس رات بھوندو کو دیوی کی یاد آئی۔ آج تک اس نے کبھی دیوی کو بلیدان نہ دیا تھا۔ پولیس کو گانٹھنا کسی قدر مشکل تھا۔ کچھ خودداری بھی کھونی پڑتی تھی۔ دیوی صرف ایک بکرا لے کر خوش ہو جائے گی۔ ہاں اس سے ایک غلطی ضرور ہوئی تھی۔ اس کی برادری کے اور لوگ عام طور پر کوئی

کام کرنے سے پہلے قربانی کرتے تھے۔ بھوندو نے یہ خطرہ نہ لیا۔ جب تک مال ہاتھ نہ لگ جائے۔ اس میں سے دیوتاؤں کو کھلا دینا حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ لوگوں سے اپنی چوری پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے کسی کو خبر نہ دی۔ یہاں تک کہ بنٹی سے بھی نہ کہا۔ اور بکرے کی تلاش میں گھر سے نکلا۔

بنٹی نے پوچھا۔

"اب کھانے کے بھگت کہاں چلے؟"

"ابھی آتا ہوں"

"مت جاؤ مجھے ڈر لگتا ہے"

بھوندو نے محبت کے اس نئے اظہار پر خوش ہو کر کہا "مجھے دیر نہ لگے گی۔ تو یہ گنڈاسا اپنے پاس رکھ لے"

اس نے گنڈاسا نکال کر بنٹی کے پاس رکھ دیا۔ اور باہر نکلا۔ مگر بکرا کہاں ملے۔ آخر اس مشکل کو بھی اس نے ایک خاص طریقہ سے حل کیا۔ قریب کی بستی میں ایک گڈرئے کے پاس کئی بکرے تھے۔ اس نے سوچا۔ وہیں سے ایک بکرا اُٹھا لاؤں۔ دیوی کو اپنی قربانی سے غرض ہے۔ یا اس سے کہ بکرا کہاں سے آیا۔ اور کیوں آیا۔

لیکن بستی کے قریب پہنچا ہی تھا، کہ پولیس کے چار آدمیوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ اور مشکیں باندھ کر تھانے لے چلے۔

۳

بنٹی کھانا پکا کر بناؤ سنگار کرنے لگی۔ آج اسے اپنی زندگی گلزار

معلوم ہوتی تھی۔ مسرت سے کھلی جاتی تھی۔ آج اپنی عمر میں پہلی مرتبہ اس کے سر میں خوشبودار تیل پڑا۔ اس کا آئینہ خراب ہو گیا تھا۔ اس میں اب منہ بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ آج وہ نیا آئینہ لائی تھی۔ اس کے سامنے بیٹھ کر اس نے بال سنوارے۔ اُبٹن ملا۔ صابن لانا وہ بھول گئی تھی۔ صاحب لوگ صابن لگانے ہی سے تو اتنے گورے ہو جاتے ہیں۔ صابن ہوتا، تو اس کا رنگ بھی کچھ نکھر آتا۔ ایک ہی دن میں بالکل گوری تو نہ ہو جاتی۔ لیکن رنگ ایسا سیاہ بھی نہ رہتا۔ کل وہ صابن کی ٹکیاں ضرور خرید لائے گی۔ اور روز اس سے منہ دھوئے گی۔ بال سنوار کر اس نے ماتھے پر السی کا لعاب لگایا۔ کہ بال اِدھر اُدھر منتشر نہ ہو جائیں۔ پھر پان لگائے۔ چونا زیادہ ہو گیا تھا۔ اس لئے منہ میں چھالے پڑ گئے۔ لیکن اس نے سمجھا شاید پان کھانے کا یہی مزہ ہے۔ آخر کڑوی مرچ بھی تو لوگ مزے لے کر کھاتے ہی ہیں۔ گلابی رنگ کی ساڑھی پہن کر اور پھولوں کا ہار گلے میں ڈال کر اس نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی۔ تو اس کے آبنوسی رنگ پر سُرخی دوڑ گئی۔ اپنے آپ کو دیکھ کر شرما گئی۔ افلاس کی آگ میں نسائیت بھی جل کر خاک سیاہ ہو جاتی ہے۔ نسائیت کی حیا کا ذکر ہی کیا ہے۔ میلے کچیلے کپڑے پہن کر شرمانا ایسا ہی ہے۔ جیسے کوئی چنوں میں خوشبو لگا کر کھائے۔

اسی طرح بناؤ سنگار کر کے بنی ٹھنی بھوندو کی راہ دیکھنے لگی۔ جب دیر ہو گئی۔ اور وہ نہ آیا، تو اس پر جھنجھلا اُٹھی۔ "روج تو سانجھ سے دروازے پر پڑے رہتے تھے۔ آج نہ جانے کہاں جا کر بیٹھ رہے۔"

بنّی کے سوکھے دل میں آج پانی پڑتے ہی اس کی نسائیت اُگ آئی تھی۔ خفگی کے ساتھ اسے فکر بھی ہو رہی تھی۔ اس نے باہر نکل کر کئی مرتبہ پکارا۔ اس کی آواز میں ایسی شیرینی کبھی نہ تھی۔ اسے کئی مرتبہ شبہہ ہوا، کہ بھوندو آ رہا ہے۔ وہ دوسری مرتبہ سر کی کے اندر دوڑ آئی۔ اور آئینہ میں اپنا منہ دیکھا۔ کہ کچھ بگڑ نہ گیا ہو۔ ایسی دھڑکن، ایسی الجھن اسے آج تک کبھی نہ ہوئی تھی۔

بنّی شوہر کے انتظار میں ساری رات بے قرار رہی۔ جوں جوں رات گذرتی جاتی تھی۔ اس کے اندیشے بڑھتے جاتے تھے۔ آج ہی اس کی پُر لطف زندگی کا آغاز ہوا تھا۔ آج ہی یہ حال!

صبح جب وہ اٹھی، تو ابھی کچھ اندھیرا ہی تھا۔ اس کا جسم شب بیداری سے ٹوٹ رہا تھا۔ آنکھوں سے آگ نکل رہی تھی۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔ معاً کسی نے آ کر کہا۔

"اری بنّی رات بھوندو پکڑا گیا۔"

۴

بنّی تھانے پہنچی، تو پسینہ میں بھیگی ہوئی تھی۔ اور دم پھول رہا تھا۔ اسے بھوندو پر رحم نہ آتا تھا۔ غصہ آتا تھا۔ سارا زمانہ کام کرتا ہے۔ اور چین کی بنسی بجاتا ہے۔ انہوں نے گہنے سُننے پر ہاتھ بھی لگایا، تو چوک گئے۔ شعور نہ تھا، تو صاف کہہ دیتے، کہ یہ کام مجھ سے نہ ہوگا۔ میں یہ تھوڑے ہی کہتی تھی، کہ آگ میں کود پڑو۔

اسے دیکھتے ہی تھانے دار نے دھونس جمائی۔ "یہی تو ہے

بھوندو کی عورت، اسے بھی پکڑ لو۔"

بنٹی نے اکڑ کر کہا۔" ہاں ہاں پکڑ لو۔ یہاں کسی سے نہیں ڈرتے۔ جب ڈرنے کا کام نہیں کرتے، تو ڈریں کیوں؟"

افسر اور ماتحت سب بنٹی کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کا دل بھوندو کی طرف سے کچھ نرم ہو گیا۔ اب تک وہ دھوپ میں کھڑا تھا۔ اب اسے سائے میں لے آئے۔ اس نے ایک مرتبہ بنٹی کی طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہا تھا۔" دیکھنا، کہیں ان لوگوں کے دھوکے میں نہ آجانا۔"

تھانیدار نے ڈانٹ کر کہا۔

" ذرا اس کی دیدہ دلیری تو دیکھو، جیسے پاکیزگی کی دیوی ہی تو ہے۔ مگر اس پھیر میں نہ رہنا۔ میں تم لوگوں کی نس نس سے واقف ہوں۔ تین سال کے لئے بھجوا دوں گا۔ تین سال کے لئے۔ صاف صاف کہہ دو۔ اور سارا مال لوٹا دو۔ اسی میں خیریت ہے۔"

بھوندو نے بیٹھے بیٹھے کہا۔" کیا کہہ دوں۔ جو لوگوں کو لوٹتے ہیں۔ ان سے تو کوئی کچھ نہیں کہتا۔ اور جو غریب محنت کی کمائی کھاتے ہیں۔ ان کا گلا کاٹنے کو سبھی تیار ہو جاتے ہیں۔ ہمارا قصور صرف یہ ہے، کہ ہمارے پاس کسی کو دینے دلانے کے لئے کچھ نہیں ہے۔"

تھانے دار نے سخت لہجہ میں کہا۔" ہاں ہاں سکھا پڑھا دے بیوی کو، کہ کہیں کچھ بھید نہ کھول دے۔ لیکن ان گیدڑ بھبکیوں سے بچ نہیں سکتا۔ تو نے اقبال نہ کر لیا۔ تو تین سال کے لئے جائے گا۔ میرا کیا بگڑتا ہے۔ ارے چھوٹے سنگھ۔ اسے پکڑ کر کوٹھڑی میں بند کر دے۔"

بھوندو نے بے پروائی سے کہا۔ "داروگا ساب۔ بوٹی بوٹی کاٹ ڈالو۔ مگر کچھ ہاتھ نہ لگے گا۔ آپ کی دھمکیوں کے سامنے بڑے بڑے سیدھے ہو جاتے ہیں۔ مگر میں دوسری قسم کا آدمی ہوں۔"

داروغہ صاحب کو یقین ہو گیا، کہ اس فولاد کا جھکانا دشوار ہے۔ بھوندو کے بشرہ سے شہیدوں کا سا استقلال نظر آتا تھا۔ تھانیدار کا حکم پاتے ہی دو آدمیوں نے بھوندو کو پکڑ کر کمرے میں بند کر دیا۔ شوہر کی بے بسی دیکھ کر بنٹی کا سینہ پھٹا جاتا تھا۔ وہ جانتی تھی، کہ کنجڑوں میں چوری کر کے اقبال کر لینا انتہا درجہ کی ذلت ہے۔ خدا جانے اس کا نتیجہ کیا ہو، خدا جانے کتنی سزا ہو جائے۔ ممکن ہے تین ہی سال کے لئے چلا جائے۔ جان پر کھیل کر بولی۔ "داروگاجی۔ تم سمجھتے ہو گے ان گریبوں کی پیٹھ پر کوئی نہیں۔ لیکن بھگوان تو سب کچھ دیکھتے ہیں۔ بھلا چاہو، تو ان کو چھوڑ دو۔ کید ہو گئے، تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔"

تھانیدار نے مسکرا کر کہا۔ "تجھے کیا۔ یہ مر جائے گا۔ کسی اور سے بیاہ کر لینا۔ جو کچھ چوری کر کے لایا ہو گا۔ وہ تو تیرے ہی پاس ہو گا۔ کیوں نہیں اقبال کر کے چھڑا لیتی۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ مقدمہ نہ چلاؤں گا۔ سب مال لوٹا دے۔ تو نے ہی منتر دیا ہو گا۔ گلابی ساڑھی اور پان اور خوشبودار تیل کے لئے تو ہی بے قرار ہو رہی ہو گی۔ اس پر مقدمہ چل رہا ہے۔ اور سامنے کھڑی دیکھ رہی ہے۔ عجیب عورت ہے۔"

بنٹی نے چند لمحے غور کیا۔ اور پھر سر جھکا کر آہستہ سے بولی۔

"اچھا داروگا ساب۔ میں سب کچھ دے دوں گی۔ ان پر حرف نہ آنے پائے۔"

۵

بھوندو کو باہر نکالا گیا۔ تو اس نے خائف ہو کر پوچھا۔ "کیوں کیا بات ہے؟"

ایک چوکیدار نے کہا "تیری عورت نے اقبال کر لیا"۔

بھوندو پہلی مرتبہ پھنسا تھا۔ اس کا سر چکر کھا رہا تھا۔ آواز بند سی ہو گئی تھی۔ لیکن یہ بات سنتے ہی جیسے وہ بیدار ہو گیا۔ اس نے دونوں مٹھیاں کس لیں۔ اور بولا۔ "کیا کہا؟"

"کیا کہا۔ چوری کھل گئی۔ داروغہ صاحب مال برآمد کرنے گئے ہیں۔ رات ہی اقبال کر لیے"، تو یہ نوبت کاہے کو آتی؟"

بھوندو نے گرج کر کہا۔ "وہ جھوٹ بولتی ہے!"

"وہاں مال بھی برآمد ہو گیا، تم ابھی تک اپنی ہی گا رہے ہو"۔

اپنے آبا واجداد کی وضعداری اپنے ہاتھوں خاک میں ملتے دیکھ کر بھوندو کا سر جھک گیا۔ اس جگر سوز ذلّت کے بعد اب اُسے اپنی زندگی میں رسوائی اور نفرت اور بے عزتی کے سوائے اور کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ اب اس نے سوچا۔ وہ اپنی برادری میں کسی کو منہ نہ دکھا سکے گا۔

یکایک بنٹی آ کر سامنے کھڑی ہو گئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی، کہ بھوندو کی خونخوار شکل دیکھ کر اسے بولنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اُسے دیکھتے ہی بھوندو کا مجروح خاندانی وقار کچلے ہوئے سانپ کی طرح تڑپ اُٹھا۔ اس نے بنٹی کو آتشیں آنکھوں سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خون کی آگ جل رہی تھی۔

بنٹی سر سے پاؤں تک کانپ اُٹھی۔ اور اُلٹے پاؤں وہاں سے

بھاگی۔

کسی دیوتا کے آہنی ہتھیاروں کی مانند وہ دونوں انگاروں کی سی آنکھیں اس کے دل میں چبھنے لگیں۔

تھانے سے نکل کر بنٹے نے سوچا۔ اب کہاں جاؤں؟ بھوندو اس کے ساتھ ہوتا، تو وہ پڑوسیوں کے طعنے برداشت کر سکتی تھی۔ لیکن اب وہ اکیلی تھی۔ اس کے لئے گھر جانا ناممکن تھا۔ اور بھوندو کی وہ دو انگاروں کی سی آنکھیں اس کے دل میں چبھی جاتی تھیں۔ لیکن کل کی عیش و آرام کی چیزوں کا پیار اُسے ڈیرے کی طرف کھینچنے لگا۔ شراب کی بوتل اب بھی بھری رکھی تھی۔ پھلوڑیاں چھینکے پر ہانڈی میں پڑی تھیں۔ وہ تشنہ آرزو وہیں جو موت کو سامنے دیکھ کر بھی دنیا کی نعمتوں کی طرف دل کو مائل کرتی ہیں۔ اسے کھینچ کر ڈیرہ کی طرف لے چلیں۔

دوپہر کا وقت تھا۔ وہ پڑاؤ پر پہنچی۔ تو سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ابھی کچھ دیر قبل جو جگہ رنگینیٔ حیات سے گلزار بنی ہوئی تھی۔ اب وہاں سوائے ویرانے کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ یہ برادری کا انتقام تھا۔ سب نے سمجھ لیا کہ بھوندو اب ہمارا آدمی نہیں۔ صرف اس کی سرکی اس ویرانے میں گویا روتی ہوئی کھڑی تھی۔ بنٹے نے اس کے اندر پاؤں رکھا۔ تو اس کی وہی حالت ہوئی، جو خالی گھر دیکھ کر کسی چور کی ہوتی ہے۔ کون کون سی چیز اُٹھائے۔ اس جھونپڑی میں اس نے رو رو کر پانچ برس کاٹے تھے۔ لیکن آج اسے اس سے وہ محبت پیدا ہو گئی تھی، جو کسی ماں کے دل میں اپنے نالائق بیٹے کو دیکھ کر ہوتی ہے، جو برسوں کے بعد پردیس سے لوٹا ہو۔ ہوا سے کچھ اشیاء ادھر ادھر ہو گئی تھیں۔ اس نے انہیں اُٹھا کر ان

کی جگہ پر رکھ دیا۔ پھلوڑیوں کی ہانڈی کچھ ہل گئی تھی۔ بنٹی کو شبہ ہوا، کہ شاید اس پر کوئی بلی جھپٹی ہو۔ اس نے جلدی سے ہانڈی اُتار کر دیکھا۔ پھلوڑیاں کسی نے چھیڑی تھیں۔ پانوں پر جو گیلا کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ وہ خشک ہو گیا تھا۔ اس نے اس پر پانی چھڑک دیا۔

کسی کے پاؤں کی آہٹ پا کر اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ بھوندو آرہا ہے۔ اس کی وہ انگارے کی سی آنکھیں! بنٹی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بھوندو کے غصّہ کا اسے ایک دو مرتبہ تجربہ ہو چکا تھا۔ لیکن اس نے دل کو مضبوط کیا۔ کیوں مارے گا؟ کچھ سُنے گا۔ سوال جواب کریگا۔ یا یوں ہی گنڈاسا چلا دے گا؟ اس نے اس کے ساتھ کوئی بُرائی نہیں کی۔ اسے آفت سے بچایا ہے۔ مرجادا جان سے پیاری نہیں ہوتی۔ بھوندو کو ہوگی، اسے نہیں ہے۔ کیا اتنی سی بات پر وہ اس کی جان لے لے گا؟

اس نے سرکی کے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ بھوندو نہ تھا۔ اس کا گدھا آرہا تھا۔ بنٹی آج اس بدبخت گدھے کو دیکھ کر ایسی خوش ہوئی۔ جیسے اپنا بھائی میکے سے بتاشوں کی پوٹلی لئے تھکا ماندہ چلا آرہا ہو۔ اس نے جا کر اس کی گردن سہلائی۔ اور اس کے تھوتھنے کو منہ سے لگا لیا۔ وہ اسے پھوٹی آنکھوں سے نہ بھاتا تھا۔ پر آج اسے اپنا عزیز معلوم ہوتا تھا۔ وہ دونوں انگارے سی آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ وہ پھر کانپ اٹھی۔

اس نے پھر سوچا۔ کیا کسی طرح نہ چھوڑے گا۔ وہ روتی ہوئی اس کے پیروں پر گر پڑے گی۔ کیا تب بھی نہ چھوڑے گا۔ ان کی آنکھوں کی وہ کتنی تعریف کیا کرتا تھا۔ کیا آج ان میں آنسو دیکھ کر بھی اُسے رحم نہ آئیگا؟

بنٹی نے مٹی کے پیالے میں شراب انڈیل کر پی - اور پھلوڑیاں کھائیں - جب اسے مرنا ہی ہے، تو دل میں حسرت کیوں رہ جائے - وہ دونوں انگارے سی آنکھیں اب بھی اس کے سامنے تھیں - اس نے دوسرا پیالہ بھرا - اور وہ بھی پی گئی - زہریلا ٹھرا - جسے دوپہر کی گرمی نے اور بھی قاتل بنا دیا تھا - دیکھتے دیکھتے اس کے دماغ کو کھولانے لگا - بوتل آدھی رہ گئی -

اس نے سوچا - بھوندو پوچھے گا - تو نے اتنی دارو کیوں پی ؟ تو وہ کیا کہے گی - کہہ دے گی - ہاں پی، کیوں نہ پیئے - اسی کے لئے تو یہ سب کچھ ہوا - وہ ایک بوند بھی نہ چھوڑے گی - جو ہونا ہے - ہو جائے - بھوندو اسے مار نہ سکے گا - وہ اتنا ظالم، اتنا کمینہ نہیں ہے - اس نے پھر پیالہ بھرا - اور پی گئی - پانچ برس کی گذری ہوئی باتیں اسے یاد آنے لگیں سینکڑوں مرتبہ دونوں میں لڑائیاں ہوئی تھیں - آج بنٹی کو ہر مرتبہ اپنی ہی زیادتی معلوم ہو رہی تھی - بے چارا جو کچھ کماتا ہے - اسی کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے - اپنے لئے ایک پیسہ کا تمباکو بھی لیتا ہے، تو پیسہ اسی سے مانگتا ہے - صبح سے شام تک بن بن پھرتا ہے - جو کام اس سے نہیں ہوتا، اسے کیونکر کرے -

معاً ایک کانسٹیبل نے آ کر کہا: "ارے بنٹی - کہاں ہے چل دیکھ بھوندو کا حال - بے حال ہو رہا ہے - ابھی تک تو چپ چاپ بیٹھا تھا - پھر نہ جانے کیا جی میں آیا - کہ ایک پتھر پر سر پٹک دیا - سر سے لہو بہہ رہا ہے - ہم لوگ دوڑ کر پکڑ نہ لیتے، تو جان ہی دے دی تھی"

۶

ایک ہفتہ گذر گیا۔ شام کا وقت تھا۔ کالی کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں موسلا دھار برکھا ہو رہی تھی۔ بھوندو کی سر کی اب بھی اس ویرانے میں کھڑی تھی۔ بھوندو کھٹولی پر پڑا تھا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور جسم مرجھا گیا تھا۔ وہ فکرمندانہ انداز سے بارش کی طرف دیکھتا ہے۔ چاہتا ہے۔ اُٹھ کر باہر دیکھوں۔ مگر اُٹھا نہیں جاتا۔

بنٹی سر پر گھاس کی ایک گٹھڑی لئے پانی میں شرابور آتی دکھائی دی۔ وہی گلابی ساڑھی ہے۔ مگر تار تار۔ لیکن اس کا چہرہ کھلا ہوا ہے۔ رنج و افسوس کی جگہ اس کی آنکھوں سے محبت ٹپک رہی ہے۔ چال ایسی مستانہ ہے۔ اور آنکھیں ایسی چمکتی ہیں کہ دیکھ کر جی خوش ہو جائے۔

بھوندو نے آہستہ آہستہ کہا۔ "تو اتنی بھیگ رہی ہے۔ کہیں بیمار پڑ گئی تو کوئی ایک گھونٹ پانی دینے والا بھی نہ رہے گا۔ میں کہتا ہوں، تو اتنا کیوں مرتی ہے۔ دو گٹھے تو بیچ چکی تھی۔ اب یہ تیسرا گٹھا لانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ ہانڈی میں کیا لائی ہے؟"

بنٹی نے ہانڈی کو چھپاتے ہوئے کہا۔ "کچھ بھی تو نہیں ہے۔ کیسی ہانڈی؟"

بھوندو زور لگا کر کھٹولی سے اُٹھا۔ آنچل کے نیچے چھپی ہوئی ہانڈی کھول اور اس کے اندر نظر ڈال کر بولا۔ "ابھی لوٹا۔ نہیں تو ہانڈی پھوڑ دوں گا؟"

بنٹی نے دھوتی پکڑتے ہوئے کہا۔ "ذرا آئینہ میں صورت دیکھو گھی دودھ کچھ نہ ملے گا۔ تو کیسے اٹھو گے؟ ہمیشہ چارپائی پر ہی پڑے رہتے

کا ارادہ ہے ؟"

بھوندو نے کھٹولی پر لیٹے ہوئے کہا۔ "اپنے لئے تو ایک ساڑھی بھی نہیں لائی، میرے لئے گھی اور دودھ سب چاہیے۔ میں گھی نہ کھاؤں گا۔"

بنٹی نے مسکرا کر کہا۔ "اسی لئے تو گھی کھلاتی ہوں، کہ تم جلدی سے کام دھندا کرنے لگو۔ اور میرے لئے ساڑھی لاؤ۔"

بھوندو بولا۔ "تو آج کہیں چوری کرنے جاؤں۔ کیوں؟"

بنٹی نے بھوندو کے گال پر آہستہ سے چپت لگا کر کہا۔ "پہلے میرا گلا کاٹ دینا، پھر جانا۔"

وفا کی دیوی

ماگھ کا مہینہ، صبح کا وقت، ہردوار میں گنگا کا کنارہ، اشنان کا میلہ صبح کی زریں شعاعوں میں سامنے کی پہاڑیاں نہائی کھڑی ہیں۔ جاتریوں کا اتنا ہجوم ہے کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ جا بجا سادھو سنتوں، اور بھجن گانے والوں کی ٹولیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ اس وقت سانگلی کے کنور صاحب اور ان کی رانی اشنان کرنے آئے ہیں۔ ان کے ساتھ ان کی چھ سال کی لڑکی بھی ہے۔ کنور صاحب کے سر پر جے پوری پگڑی۔ نیچی اچکن امرتسری جوتے، بڑی بڑی مونچھیں، تناور جسم، رانی گندمی رنگ، نازک بدن۔ زیوروں سے لدی ہوئی، لڑکی بھی زیور پہنے ہوئے ہے۔ ان کے ساتھ کئی سپاہی، پیادے۔ بھالے بلّم لئے۔ وردیاں پہنے چلے آرہے ہیں۔ کئی خدمت گار بھی ہیں۔

یہ لوگ ہجوم کو ہٹاتے دریا کے کنارے پہنچ کر اشنان کرتے ہیں۔ رانی کے اشنان کے لئے چار آدمی پردہ کرتے ہیں۔ لڑکی پانی سے کھیل رہی ہے۔ راجہ صاحب پنڈتوں کو دان دے رہے ہیں۔ اور لڑکی اپنی کشتی پانی میں تیرا رہی ہے۔ یکایک کشتی ایک ریلے میں بہہ جاتی ہے۔ لڑکی اسے پکڑنے کے لئے لپکتی ہے۔ اسی وقت آدمیوں کا ایسا ریلا آتا ہے، کہ لڑکی ماں باپ سے الگ ہو جاتی ہے۔ کبھی ادھر بھاگنا، کبھی اُدھر، بار بار اپنی ماں کو دیکھنے کا دھوکا ہوتا ہے۔ پھر وہ رونے لگتی ہے۔ مارے خوف کے کسی سے کچھ بولتی نہیں۔ نہ راستہ پوچھتی ہے۔ کھڑی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے۔ اور رہ رہ کر اپنی ماں کو پکارتی ہے۔ یکایک ایک راستہ دیکھ کر اسے قیام گاہ کے راستے کا گمان ہوتا ہے۔ اسی پر ہو لیتی ہے۔ مگر وہ راستہ اسے دھرم شالہ سے دور لئے جا رہا ہے۔

ادھر کنور صاحب اور ان کی رانی لڑکی کو نہ پا کر ادھر ادھر تلاش کرنے لگتے ہیں۔ بدحواس ہو کر اپنے ملازموں پر بگڑتے ہیں۔ ملازم لڑکی کی تلاش میں چلے جاتے ہیں۔ رانی ایک چھوٹی لڑکی کو دیکھ کر بے اختیار اس کی طرف دوڑتی ہے۔ مگر جب اپنی غلطی ظاہر ہوتی ہے، تو آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگتی ہے۔ کنور صاحب غصّہ سے آگ ہو رہے ہیں۔ مگر کہیں تلاش کرنے نہیں جاتے۔ ابھی ان کا صافا ٹھیک نہیں ہوا۔ اچکن بھی سجل نہیں ہوئی۔ بال بھی نہیں سنوارے جا سکے۔ نوکر تو اب وہاں رہے نہیں۔ تب وہ پنڈتوں پر بگڑتے ہیں۔ اور بالآخر نک سک سے درست ہو کر، کمر میں تلوار لگا کر، لڑکی کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ اسی اثناء میں رانی نے گنگا کے کنارے آ کر منّت مانی ہے۔ ہجوم کے مارے ایک ایک

قدم چلنا مشکل ہے۔ ہجوم بڑھتا جاتا ہے۔ بے چارے غم نصیب ماں باپ دھکے ہیں کبھی دو قدم آگے بڑھتے ہیں۔ کبھی دس قدم پیچھے چلے جاتے ہیں۔

اُدھر لڑکی روتی ہوئی اپنے دھرم شالہ کو پہچاننے کی کوشش کرتی دور چلی جا رہی ہے۔

دفعتاً کنور صاحب کو خیال آتا ہے، کہ شاید لڑکی دھرم شالے میں پہنچ گئی۔ اور نوکروں نے اسے پا لیا ہو۔ دونوں فوراً بھیڑ کو ہٹاتے دھرم شالہ کی طرف چلتے ہیں۔ مگر وہاں پہنچ کر دیکھتے ہیں، تو لڑکی کا پتہ نہیں۔ دونوں پھر گھبرا کر نکل پڑتے ہیں۔ دل لگی یہ ہے، کہ آگے آگے لڑکی روتی چلی جاتی ہے۔ پیچھے پیچھے ماں باپ اس کی تلاش میں جا رہے ہیں۔ بیچ میں صرف بیس گز کا فاصلہ ہے، مگر دونوں میں مڈبھیڑ نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ گھنٹوں گذر جاتے ہیں۔ بادل گھر آتا ہے۔ رانی تھک جاتی ہے۔ اس سے ایک قدم بھی نہیں چلا جاتا۔ وہ سڑک کے کنارے بیٹھ جاتی ہے۔ اور رونے لگتی ہے۔ کنور صاحب لال لال آنکھیں نکالے، حواس باختہ، ساری دنیا پر جھلائے ہوئے ہیں۔

راج کماری مایوس ہو کر پھر ہر دوار گھاٹ کی طرف چلتی ہے۔ اور ماں باپ کے سامنے سے نکل جاتی ہے۔ مگر دونوں کی نگاہیں دوسری طرف ہیں۔ آنکھیں چار نہیں ہوتیں۔

اتنے میں ایک جٹا دھاری مہاتما کندھے پر مرگ چھالا ڈالے، طنبورا ہاتھ میں لئے چلے آ رہے ہیں۔ راجکماری کو گھبرایا دیکھ کر سمجھ جاتے ہیں، کہ اپنے گھر والوں سے الگ ہو گئی ہے۔ اسے گود میں اُٹھا لیتے ہیں۔ اور اس

سے اس کے گھر کا پتہ پوچھتے ہیں۔ لڑکی نہ اپنے والدین کا نام بتلا سکتی ہے نہ اپنے گھر کا پتہ۔ وہ صرف رو رہی ہے۔ مارے خوف کے اس کی زبان ہی نہیں کھلتی۔

اب سادھو کے دل میں ایک نئی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ وہ لڑکی کو گود میں لئے سوچ رہے ہیں، 'مجھے کیا کرنا چاہئے'۔ ان کا دل کہتا ہے۔ جب اس کے والدین کا پتہ ہی نہیں، تو میں کیا کر سکتا ہوں؟ ان کا نفس اس لڑکی کو چھپا رکھنے کی تحریک کرتا ہے۔ وہ راج کماری کو لئے اپنی کٹی کی طرف چلے جاتے ہیں۔ ان کی لڑکی اور بیوی دونوں مر چکی ہیں۔ اسی غم میں وہ دنیا سے کنارہ کش ہو گئے ہیں۔ اس چاند سی لڑکی کو پا کر ان کے دل میں پھر محبت پدری تازہ ہو جاتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں، پرماتما نے ان پر رحم کھا کر یہ شمعِ زندگی کو روشن کرنے کے لئے بھیجی ہے۔

۲

کوہستانی مقام میں ایک صاف ستھری، بیلوں اور پھولوں سے آراستہ کٹی ہے۔ پشت کی طرف بہت گہرائی میں دریا بہہ رہا ہے۔ کٹی کے سامنے چھوٹا سا میدان ہے۔ دو ہرن اور دو مور میدان میں پھر رہے ہیں۔ وہی مہاتما کٹی کے سامنے ایک چٹان پر بیٹھے طنبورے پر گا رہے ہیں۔ راجکماری بھی اُن کے سُر میں سُر ملا کر گا رہی ہے۔ اس کی عمر اب دس سال کی ہوگی۔ بھجن گا چکنے کے بعد لڑکی پھول چننے لگتی ہے۔ اور ایک مالا بناتی ہے۔ پھر کٹی میں جا کر ٹھاکر جی کو اشنان کراتی ہے۔ سادھو بھی آ جاتے ہیں۔ اور دونوں ٹھاکر جی کی استت کہتے ہیں۔ پھر وہ وجد میں آ کر ناچنے لگتے ہیں۔ ذرا دیر بعد لڑکی بھی رقص کرنے لگتی

ہے۔ کیرتن ختم ہو جانے کے بعد دونوں چرن امرت لیتے ہیں۔ اور سادھو راجکماری کو (جس کا نام اب اندرا رکھا گیا ہے) پڑھانے لگتے ہیں۔ انہیں اس کو گانا، بجانا، ناچنا سِکھانے اور پڑھانے میں روحانی لطف حاصل ہوتا ہے۔ ان کی دلی آرزو ہے، کہ اندرا ایشور بھجن اور دنیا کی خدمت میں اپنی زندگی صرف کر دے۔ وہ اس مبارک دن کا خواب دیکھتے ہیں۔ جب اندرا ٹھاکر جی کے سامنے میرا کی طرح گائے گی۔ اور وجد میں آ کر ناچے گی۔ اندرا اتنی حسین، اتنی خوش گلو، اور رقص کرنے میں اتنی مشاق ہے، کہ جب وہ رات کو کیرتن کرنے لگتی ہے۔ تو بھگتوں کی بھیڑ لگ جاتی ہے۔

مہاتما جی نے یہ پانچ سال اسی کٹی میں کاٹے ہیں۔ اب اندرا سفر کی تکلیفیں برداشت کرنے کے قابل ہو گئی ہے۔ اس لئے اب سادھو تیرتھ یاترا کرنے نکلتے ہیں۔ بھگت لوگ انہیں رخصت کرنے آتے ہیں۔ ایک بھگت کو وہ کٹی سپرد کر دی جاتی ہے۔ اور مہاتما جی اندرا کے ساتھ تیرتھ یاترا کو روانہ ہو جاتے ہیں۔

مہاتما جی برسوں تک تیرتھ استھانوں کی یاترا کرتے رہتے ہیں۔ کبھی بدری ناتھ جاتے ہیں۔ کبھی کیدار ناتھ، کبھی دوارکا، کبھی رامیشور، کبھی متھرا، کبھی کاشی، کبھی پوری، ہر جگہ مندر میں دونوں کیرتن کرتے ہیں۔ اور عقیدت مندوں کو معرفت کے نشہ سے متوالا کر دیتے ہیں۔ اب مہاتما جی اندرا کو شاستر اور وید کی بھی تلقین کرتے ہیں۔ اکثر جب مہاتما دھیان میں مگن ہو جاتے ہیں، تو اندرا ویدوں کا مطالعہ کرتی ہے۔

۳

ایک دن مہاتما جی اور اندرا دونوں ایک گاؤں میں جا پہنچتے ہیں۔ یہ گاؤں مسلمانوں کا ہے ۔ایک ہفتہ سے طاعون پھیلا ہوا ہے ۔گاؤں کے باہر لوگ جھونپڑیاں ڈالے پڑے ہیں۔ مہاتما جی ایک درخت کے نیچے آسن جماتے ہیں۔ اور طاعون زدہ لوگوں کا معالجہ کرتے ہیں۔ اندرا بھی عورتوں کی خدمت میں مصروف ہو جاتی ہے ۔جڑی بوٹیاں تلاش کرنا، دوائیں بنانا، مریضوں کو اُٹھانا بٹھانا، ان کے بچوں کے لئے کھانے پینے کی فکر کرنا، ان دونوں کا روزمرہ کا کام ہے ۔یہاں تک کہ مہاتما جی کو طاعون ہو جاتا ہے ۔اور وہ اسی درخت کے نیچے پڑ جاتے ہیں۔ گاؤں میں بیماری بہت کم ہو گئی ہے ۔ زیادہ تر لوگ اچھے ہو گئے ہیں ۔اس گاؤں کے سبھی زن و مرد اور قرب و جوار کے دیہات کے لوگ مہاتما جی کی تیمارداری کے لئے آتے ہیں۔ لیکن مہاتما جی کی حالت خراب ہوتی جاتی ہے ۔اور ایک دن وہ اندرا کو بلا کر ایشور بھجن اور عوام الناس کی خدمت کا اُپدیش کر کے ٹھاکر جی کے چرنوں کا دھیان کرتے ہوئے سمادھی لے لیتے ہیں۔ گاؤں میں کہرام مچ جاتا ہے ۔ مہاتما جی کی ارتھی دھوم دھام اور باجے گاجے کے ساتھ نکلتی ہے ۔بھجن گانے والوں کی ایک منڈلی بھی ساتھ ہے گاؤں کا چکر لگانے کے بعد اسی درخت کے سایہ میں ان کی چھتری بنتی ہے ۔

اندرا کی عمر اس وقت بیس اکیس سال ہے ۔اور اس کے چہرہ پر ایسا جلال ہے، کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں جھک جاتی ہیں ۔اس کا مضبوط جسم ہر قسم کی سختیاں جھیلنے کا عادی ہو گیا ہے ۔ گاؤں کے لوگ چاہتے ہیں۔

وہ اسی گاؤں میں رہے ۔ مگر اس سے اب اپنے محسن کی جدائی نہیں برداشت ہوتی ۔ جس گاؤں میں اس پر یہ مصیبت پڑی ۔ اس میں وہ اب نہیں رہ سکتی ۔ وہ دل کو اس خیال سے تسکین دینا چاہتی ہے، کہ ایشور کو جو کچھ منظور تھا، ہوا ۔ مگر کسی طرح تسکین نہیں ہوتی ۔ آخر ایک دن میں وہ سب سے رخصت ہو کر نکل پڑتی ہے ۔ اس کی کمر میں چھپی ہوئی کٹار ہے ۔ ہاتھ میں طنبورا اور کنڈل اور کندھے پر مرگ چھالا ۔

وہ گاؤں گاؤں اور شہر شہر ایشور کے بھجن سناتی اور عوام کے دلوں میں بھگتی اور سیوا کی شمع جلاتی پھرتی ہے ۔ وہ جس شہر میں جا پہنچتی ہے بات کی بات میں ہزاروں آدمی آجاتے ہیں ۔ اس کی سواری کے لئے بہترین نعمتیں پیش کی جاتی ہیں ۔ مگر وہ نمائش اور تکلف کو حقیر سمجھتی ہوئی کسی مندر کے سامنے درخت کے سایہ میں ٹھہرتی ہے ۔ اور جو کچھ روکھا سوکھا میسّر آجاتا ہے ۔ کھا کر اپنا پیٹ بھر لیتی ہے ۔ اس کی آنکھوں کی موہنی اداؤں میں وہ کشش ہے ، کہ لوگ اس کے منہ سے ایک ایک لفظ سننے کے لئے بے قرار رہتے ہیں ۔ بڑے بڑے عیاش اور رنگین مزاج اس کے درشن کرتے ہی عقیدت سے اس کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں ۔ اندرا کو صوفی شعراء کا کلام بہت پسند ہے ۔ میرا ، کبیر وغیرہ کے دوہوں کو بڑے شوق سے پڑھتی ، اور انہیں کے بھجن گاتی ہے ۔ تلسی اور سور داس کے پدوں سے بھی اسے عشق ہے ۔ حال کے شعراء میں اسے جس کا کلام سب سے زیادہ عزیز ہے ۔ وہ ہری ہر نام کا ایک شاعر ہے ۔ وہ اس کے گیتوں کو پڑھ کر متوالی ہو جاتی ہے ۔ اس کے لئے اس کے دل میں خاص احترام ہے

وہ چاہتی ہے۔ کہیں ہری ہر سے ملاقات ہو جاتی، تو وہ اس کے قدموں کو بوسہ دیتی۔

۴

جردل ریاست کا خاص شہر، کوہستانی علاقہ، صاف ستھری سڑکیں، صاف ستھرے آدمی، عالی شان محلات، ایک نہایت خوش نما چوک۔ چاروں طرف روشنی سے جگمگاتی ہوئی دُکانیں، وسط میں ایک پارک۔ پارک میں فوّارہ۔ اندرا اسی فوّارے کے سامنے کھڑی طنبورے پر بھجن گا رہی ہے۔ ہزاروں آدمی محویت کے عالم میں کھڑے ہیں۔ جاتی ہوئی موٹریں رُک جاتی ہیں۔ اور اس پر سے رؤسا اُتر اُتر کر گانا سُننے لگتے، خوانچے والے رُک جاتے ہیں۔ اور خوانچہ لئے بھجن سننے لگتے ہیں۔ اندرا اپنے پیارے شاعر ہری ہر کا ایک معرفت میں ڈوبا ہوا پد گا رہی ہے اس کی مستانہ لَے سب کو مست کر رہی ہے۔

۵

کئی سال ہوئے، ہری ہر ایک متموّل رئیس تھا۔ شعر و سخن کا دلدادہ۔ فلسفیانہ خیالات میں ڈوبا اور تصوّف میں رنگا ہوا۔ اپنے عالی شان محل کو چھوڑ کر ایک جھونپڑی میں بیٹھا تصوّف اور فلسفہ کے جذبات کو شعر اور نغمہ کے دلفریب رنگ میں ادا کیا کرتا تھا۔ معرفت کی حقیقتیں اس کے دل و دماغ میں جا کر صفاتِ شعری سے آراستہ ہو جاتی ہیں۔ ساری رات بیٹھے گذر گئی ہے۔ اور وہ اپنے خیالات میں مست ہے کھانے پینے، کپڑے لتّے کی فکر نہیں۔ دنیا اس کی نظروں میں خواب ہے۔ محض سراب آرزو۔ اس کی کوئی چیز اس کے خیال میں ایسی نہیں

کہ انسان اس میں دل لگائے۔ وہ اپنی ملکیت اور جائیداد کی پروا نہیں کرتا۔ کاروبار کی طرف مطلق دھیان نہیں دیتا۔ کاروباری لوگ اس سے بار بار ملنے آتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے گوشۂ عافیت سے باہر نہیں نکلتا۔ ہاں اگر کوئی پھٹے حال آ جاتا ہے۔ تو فوراً آ کر اسے مہمان خانہ میں لے جاتا ہے۔ غرباء کے لئے اس کی ساری ثروت وقف ہے۔ کبھی غریبوں کو کمبل تقسیم کرتا ہے۔ کبھی غلہ۔ کوئی بھوکا سائل اس کے دروازے سے مایوس نہیں جانے پاتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قرضہ سے زیر بار ہو جاتا ہے۔ قرض خواہ نالشیں کرتے ہیں۔ اس پر ڈگری ہوتی ہے۔ ہری ہر کبھی اپنا گوشۂ تنہائی چھوڑ کر مقدمہ کی پیروی کرنے نہیں جاتا۔ اس کی جائیداد قرق ہو رہی تھی۔ اور وہ اپنی جھونپڑی میں بیٹھا ستار پر ایک پد گا رہا تھا۔ جو اس نے ابھی ابھی تصنیف کیا تھا۔ سجاوٹ اور تکلف کی چیزیں اس کے محل سے نکالی جاتی ہیں۔ اور نیلام کر دی جاتی ہیں۔ اسے مطلق غم نہیں۔ تب اس کا محل نیلام ہو جاتا ہے۔ اور وہ اسی طرح بے اثر رہتا ہے۔ اس محل میں آ کر ایک بہت بڑا رئیس قبضہ جما لیتا ہے۔ ہری ہر کے پاس اب بھی وسیع علاقہ ہے۔ وہ چاہے تو پھر شاندار محل بنوا سکتا ہے۔ مگر اسے ملکیت سے محبت نہیں۔ وہ ہر ایک گاؤں میں گھوم گھوم کر اپنی اسامیوں کو زمینداری کے حقوق عطا کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے ایک سوا ایک گاؤں سب آزاد ہو جاتے ہیں۔ وہ جس گاؤں میں جا نکلتا ہے لوگ اس کا استقبال کرنے دوڑتے ہیں۔ اور اس کے قدموں کی خاک پیشانی پر لگاتے ہیں۔ اس کے لئے ہمہ نعمت حاضر کی جاتی ہے۔ لیکن وہ گاؤں کے باہر کسی درخت کے سایہ میں مقیم ہوتا ہے۔ اور جنگلی پھل

کھا کر سو رہتا ہے۔ آخر ملکیت کی فکر سے آزاد ہو کر وہ اطمینان سے پھر اپنے گوشۂ عافیت میں آ بیٹھتا ہے۔ آج اس کی خوشی کی کوئی حد نہیں۔ اس کی کٹی میں، اب بھی کتنی ہی فالتو چیزیں ہیں۔ جنہیں اس کی نفاست پسند طبیعت نے جمع کر رکھا ہے۔ مصوّری اور صنعت کے ان کمالات کو جمع کر کے وہ ایک ڈھیر لگا دیتا ہے۔ اور اس میں آگ لگا دیتا ہے۔ اس کا ستار اور طنبورا وردف 'مورتیں'، مرگ چھالے'، تصوف اور فلسفیوں کی کتابیں سب اس ڈھیر میں جل کر خاک ہو جاتی ہیں۔ اور وہ متبسم کھڑا ان چیزوں کو خاک ہوتے ہوئے دیکھتا ہے۔

۶

شام ہو گئی ہے۔ شہر کے چوک میں اندرا اپنے طنبورے پر ایک پد گا رہی ہے۔ ہزاروں آدمیوں کا ہجوم ہے۔ بڑے بڑے رؤسا اور اُمرا، محو کھڑے ہیں۔ ہری ہر وہ نغمۂ دلنواز سُن کر چونک پڑتا ہے۔ کان لگا کر سُنتا ہے۔ اور تب لپک کر مجمع کے پیچھے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اندرا اسی کا پد گا رہی ہے۔ اس کی ایک ایک تان اس کے دل پر چوٹ کرتی ہے۔ ہری ہر کو آج اپنے کلام کی گہرائی، درد، اور تاثیر کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ نقشِ حیرت بنا کھڑا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ گانا ختم ہو جاتا ہے۔ لوگ رخصت ہو جاتے ہیں۔ اندرا بھی وہاں سے چلی جاتی ہے۔ مگر ہری ہر ابھی تک وہیں مورت کی طرح خیال میں ڈوبا ہوا بے حس و حرکت کھڑا ہے۔ جب بالکل سنّاٹا چھا جاتا ہے۔ تو اسے اپنے گرد و پیش کی خموشی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ دو ایک آدمیوں سے اندرا کا پتہ پوچھنا چاہتا ہے۔ مگر جھجک کے مارے نہیں پوچھتا۔ مجبور ہو کر وہ اپنی کٹی میں لوٹ جاتا ہے۔ اور پریم کا پہلا

گیت لکھتا ہے۔ وہ ساری رات ایک بیتابی کے عالم میں کاٹ دیتا ہے۔ اور دوسرے دن شام کو پھر چوک کی طرف جاتا ہے۔ آج بھی اندرا چوک میں گا رہی ہے۔ ہجوم کل سے کئی گنا زیادہ ہے۔ مگر کیا مجال کوئی جنبش کر سکے۔ ہری ہر بھی بت بنا ہوا سُنتا ہے۔ اور جب آدھ گھنٹہ کے بعد اندرا چلی جاتی ہے، تو وہ اس کے پیچھے ہو لیتا ہے۔ عقیدت مندوں کا ایک اژدہام ساتھ ہے۔ کٹی کے قریب پہنچ کر اندرا سب آدمیوں کو رخصت کر دیتی ہے۔ صرف ہری ہر اس کے کچھ فاصلے پر چلا آ رہا ہے۔ اندرا اپنی کٹی میں پہنچ کر پانی بھر لاتی ہے۔ اور تب ٹھاکر جی کا بھوگ لگا کر خود کھاتی ہے۔ پھر زمین پر پڑ رہتی ہے۔

سفید چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ ہری ہر کٹی کے سامنے زمین پر بیٹھ کر پتھر کے ٹکڑوں پر کوئلے سے تازہ عشق و محبت کا گیت لکھنے لگتا ہے۔ ساری رات لکھتے گذر جاتی ہے۔ جب مشرق کی طرف طلوع سحر کی سُرخی نمودار ہوتی ہے، تو وہ سنگریزوں کو کٹی کے دروازے پر ترتیب سے رکھ کر وہاں سے کچھ دور ایک درخت کے نیچے جا کر لیٹ جاتا ہے۔ سنگریزے اس طرح رکھے گئے ہیں، کہ اندرا کو اس کا پیغام محبت پڑھنے میں بالکل تردّد نہ ہو۔

علی الصبح اندرا سندھیا پوجن اور کیرتن کے بعد جب باہر نکلتی ہے۔ تو عین دروازے پر اسے چوکور سنگریزے ایک ترتیب سے رکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ حیرت میں آ کر ایک پتھر اُٹھا لیتی ہے۔ اس پر اسے کوئی تحریر نظر آتی ہے۔ ارے! یہ کوئی پریم کا نغمہ ہے۔ وہ دوسرا پتھر اُٹھاتی ہے۔ اس پر بھی وہی تحریر ہے۔ وہ اس گیت کا دوسرا بند معلوم ہوتا ہے۔ پھر وہ سارے سنگریزوں کو اُٹھا کر پڑھتی ہے۔ اور انہیں ایک قطار میں رکھ کر پورا گیت

پڑھ لیتی ہے۔ اس گیت میں وہ درد اور تاثیر ہے۔ کہ کلیجہ تھام کر رہ جاتی ہے یہ اسی زندہ جاوید ہری ہر کا کلام ہے۔ کتنی ہی بار اندرا کے دل میں خواہش پیدا ہوئی تھی، کہ اس شاعر کا درشن کرے۔ لیکن اسے کچھ خبر نہ تھی، کہ وہ کون ہے۔ کہاں رہتا ہے؟ آج یہ پیغام محبت پاکر وہ دیوانہ وار اس کی تلاش میں نکل پڑتی ہے۔ وہ کہیں قریب ہوگا۔ اس کا اسے یقین ہے۔ وہ چاروں طرف اسے تلاش کرتی ہے۔ اور آخر وہ کٹی کے عقب میں زمین پر اُسے سوتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ حیرت آمیز مسرت سے اس کے چہرہ کی طرف دیکھتی ہے۔ مکھیاں اسے ستا رہی ہیں۔ یہ دیکھ کر وہ اپنے آنچل سے مکھیاں اُڑانے لگتی ہے۔ ہری ہر کی نیند کھل جاتی ہے۔ اور اندرا کو آنچل سے پنکھا جھلتے دیکھ کر وہ اس محبت کا مزا لینے کے لئے پڑا رہتا ہے۔ تب وہ اُٹھ کر بیٹھتا ہے۔ اندرا اسے پرنام کرتی ہے۔

اب ہری ہر بھی وہیں رہتا ہے۔ وہ کٹی کے اندر رہتی ہے۔ ہری ہر باہر۔ دونوں ساتھ پہاڑیوں کی سیریں کرتے اور جنگلی پھول پھل جمع کرتے ہیں۔ پہاڑیاں اندرا کے نغموں سے گونج جاتی ہیں۔ دونوں ساتھ ٹھاکر جی کے بڑے مندر میں کیرتن کرنے جاتے ہیں۔ وہ اب شہر کے چوک میں اپنا راگ سُنانے نہیں آتی۔ اب اس کے سننے والا صرف ہری ہر ہے۔ مگر شہر کے عقیدت مندوں کی اب بھی بھیڑ لگ جاتی ہے۔ اور لوگ تحفے تحائف دیے جاتے ہیں۔ جنہیں اندرا فیاضی سے غرباء میں تقسیم کر دیتی ہے۔

۷

صبح کا وقت؛ جھیل کے کنارے ایک چٹان پر بیٹھی ہوئی اندرا گا رہی ہے۔ اور ہری ہر سامنے بیٹھا ٹھاکر جی کے لئے ایک ہار گوندھ رہا ہے۔

جھیل میں مرغابیاں، ہنس وغیرہ تیر رہے ہیں۔ کناروں پر ہرن، نیل گائے وغیرہ سب گویا اس نغمہ سے مست ہو رہے ہیں۔

یکایک راجکمار گیان سنگھ گھوڑے پر سوار ادھر سے گذرتا ہے۔ اس کے ساتھ کئی برقنداز شکاری اور مصاحب ہیں۔ نہایت شکیل مردانہ صورت کا نوجوان ہے۔ ابھی مسیں بھیگ رہی ہیں۔ اونچا قد، فراخ سینہ، اونچی پیشانی، اندرا کا نغمہ سنتے ہی اسے جیسے سکتہ سا ہو جاتا ہے۔ اس کا گھوڑا وہیں رک جاتا ہے۔ اور سارا مجمع چپ چاپ کھڑا ہو جاتا ہے۔ اندرا معرفت کے نشہ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اسے گیان سنگھ کے آنے کی مطلق خبر نہیں ہوتی۔ جب گانا ختم ہو جاتا ہے۔ تو راجکمار گھوڑے سے اُتر پڑتا ہے۔ اور اندرا کے پاس آکر ادب سے پرنام کرتا ہوا اس کا نام دریافت کرتا ہے۔ وہ اب تک بن بیاہا تھا۔ صدہا پیغامات راجوں مہاراجوں کے یہاں سے آئے تھے۔ اس نے ایک بھی منظور نہ کیا۔ آج اس حسینہ کو دیکھ کر اس پر خود فراموشی کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ وہ اسے ادب کے ساتھ اپنے محل میں آنے کی دعوت دیتا ہے اندرا ایک دن کی مہلت مانگتی ہے۔ گیان سنگھ دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے چلا جاتا ہے لیکن شکار میں اس کا دل بالکل نہیں لگتا۔ اسے یکایک شکار سے نفرت اور ہر جاندار سے انس ہو جاتا ہے۔ اسے اب ہرنوں کا شکار کرتے صدمہ ہوتا ہے۔ وہی نغمۂ درد اس کے کانوں میں گونج رہا ہے۔ اور آنکھوں میں وہی صورت بسی ہوئی ہے۔

۸

اندرا یہ دعوت پا کر خوشی سے پھولی نہیں سماتی۔ اسے اس شعلہ کی مطلق خبر نہیں، جو اس کے حسن اور نغمہ نے گیان سنگھ کے دل میں روشن کر دیا

ہے ۔ وہ سوچتی ہے ۔ شاہی عنایات کی بدولت وہ زندگی کے تفکرات سے آزاد ہو جائے گی ۔ اور ہری ہر کے ساتھ گوشۂ قناعت میں بیٹھی ہوئی زندگی کے دن کاٹ دے گی ۔ ہری ہر خیال کرتا ہے کہ اندرا رنواس میں کتنی خوش ہوگی ۔ کیونکہ راج کمار کے دل کی کیفیت اس سے مخفی نہیں رہتی ۔ کیا ایسی بے مثال حسینہ کوہ و بیابان میں پھرنے کے قابل ہے ؟ اسے ایشور نے کسی رنواس کی زینت بننے کے لئے ہی بنایا ہے ۔ ہری ہر کے ساتھ رہ کر اسے فقر و فاقہ کے سوا اور کیا نصیب ہوگا ۔ وہ اس دیوی کو ان آزمائشوں میں ڈالنا نہیں چاہتا ۔ اس کی روحانی تسکین کے لئے اتنا ہی یقین کافی ہے کہ اندرا کے دل میں اس کی جگہ ہے ۔ یہی خیال اس کی زندگی کو معراج کمال تک پہنچانے کے لئے کافی ہے ۔ اس کے دل میں اور کوئی خواہش کوئی آرزو نہیں ۔

رات گذر جاتی ہے ۔ علی الصباح ہری ہر پھولوں کے زیوروں سے اندرا کو آراستہ کرتا ہے ۔ اس دن اندرا کو عقیدت مندوں نے جتنے تحفے پیش کئے ۔ وہ سب ہری ہر نے جمع کر رکھے ہیں ۔ وہ اندرا کے حسن کو ان آرائشوں سے اور بھی چمکا دیتا ہے ۔ مگر جب موقعہ مل جاتا ہے ۔ تو اندرا کی آنکھیں بچا کر آنسوؤں کی دو چار بوندیں بھی گرا لیتا ہے ۔ اندرا سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا ہے ۔ گویا اسے کوئی اندیشہ نہیں ۔ مگر دل میں اسے یقین ہے ۔ کہ اب پھر اندرا کے درشن نہ ہوں گے ۔ یہ خوف بھی ہے کہ اندرا کے دل میں اب اس کی یاد نہ رہے گی ۔ شاہی عیش و عشرت میں پڑ کر وہ اُسے یقیناً بھول جائے گی ۔ کون کسی کو یاد کرتا ہے ۔ لیکن وہ اس خیال سے اپنے دل کو تسکین دیتا ہے ، کہ وہ تو آرام سے رہے گی ۔ رعایا کو اس کی ذات

سے فیض پہنچے گا۔ کیا وہ اس قدر تبدیل ہو جائے گی، کہ اختیار پاکر شاہی جور وستم کے خلاف زبان نہ کھولے؟ کیا وہ مہاتما کے اپدیش کو فراموش کر سکتی ہے؟

جب اندرا بن سنور کر تیار ہو جاتی ہے، تو دونوں ساتھ بیٹھ کر کیرتن کرتے ہیں۔ آج اس کیرتن میں دونوں کے دلوں میں مختلف جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اندرا بے خبری میں خوش ہے۔ اسے اپنے روبرو بہار ہی بہار نظر آ رہی ہے۔ وہ سنیاس اور ویراگ سے سیر ہو چکی ہے۔ اور اب دنیا کی نعمتوں کا لطف اُٹھانا چاہتی ہے۔ اس کے خیال میں شاہی عنایتیں اس کے لئے آسائش کا دروازہ کھول دیں گی۔ وہ اس وقت بھی اس زندگی کا خواب دیکھ رہی ہے۔ جب وہ ہری ہر کے لئے اچھے کھانے پکائے گی۔ اس کے لئے اچھے اچھے کپڑے بنوائے گی۔ اس کے سر میں تیل ڈالے گی۔ جب وہ سوئے گا، تو اس کے لئے پنکھا جھلے گی۔ کیا ایسا باکمال، خدا رسیدہ شاعر اس قابل ہے، کہ دنیا کی ناقدری کا شکار بنے؟ مگر ہری ہر غمناک خیالات میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس کے سامنے تاریک مستقبل ہے۔ اسی وقت گیان سنگھ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ سواری لئے آ پہنچتا ہے۔

۹

شاہی محل کے آراستہ اور پُر تکلف کمرے، حسین کنیزیں، راج ماتا کا دربار لگا ہوا ہے۔ اندرا محل میں پہنچ کر راج ماتا کو پرنام کرتی ہے۔ رانی اس کی بڑی خاطر و مدارات کرتی ہیں۔ وہ اشنان کئے ہوئے پوجا کے لئے تیار بیٹھی ہے۔ اندرا ان کے ساتھ مندر میں جاتی ہے۔ جو شیشہ، د آلات سے

سجا ہوا ہے ۔ اور وہاں ان کا کیرتن ہوتا ہے ۔ اور بھی کئی شریف زادیاں رانی کے ساتھ ہیں۔ سب اندرا کا کیرتن سُن کر بے خود ہو جاتی ہیں۔ رانی صاحبہ اندرا کو گلے لگا لیتی ہیں۔ اور اپنی موتیوں کی مالا نکال کر اس کی گردن میں ڈال دیتی ہیں۔ اندرا دوسرا بھجن گاتی ہے۔ رانی اس کے قدموں پر سر رکھ دیتی ہے ۔ بھگوان سے ایسی بھگتی کبھی اس کے دل میں نہ امڈی تھی۔ اسی وقت پدما آتی ہے ۔ پدما حسن میں اندرا سے بالکل جُدا ہے۔ اس کے حُسن میں رُعب، تمکنت، ملاحت اور کشش ہے ۔ اندرا کے حسن میں نزاکت اور انکسار۔ ایک چنبیلی کا پھول ہے ۔سادہ اور نازک، اس کا حسن اس کی نزاکت اور سادگی میں ہے ۔ دوسرا سورج مکھی ہے ۔ خوش رنگ اور نظر فریب پدما کا باپ سردار کیسری سنگھ راج میں وزارت کے عہدے پر مامور ہے ۔ وہ پدما کی شادی راج کمار گیان سنگھ سے کرنا چاہتا ہے ۔ پدما بھی راجکمار کو سچے دل سے چاہتی ہے ۔مگر راجکمار اس کی طرف زیادہ مائل نہیں۔ پھر بھی اس کی بہت خاطر اور دلجوئی کرتا ہے ۔

پدما آکر راجکمار کو اندرا کی طرف گرویدہ نظروں سے تاکتے دیکھتی ہے یہ بھی دیکھتی ہے، کہ یہاں اس کی قدر و منزلت ہو رہی ہے۔ خود اس کی اتنی قدر کبھی نہ ہوئی تھی۔ یہ معمولی، بازاروں میں گانے والی عورت اس سے بازی لے جائے ۔ اس خیال سے وہ دل میں جل جاتی ہے۔ اندرا سے اسے فوراً حسد و رقابت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اسے ذلیل کرنے کے منصوبے باندھنے لگتی ہے ۔ وہ رانی صاحبہ کو اس سے بدگمان کرنا چاہتی ہے ۔ اس کی شکل و صورت، وضع قطع کا مذاق اڑاتی ہے ۔ مگر جب اس بداندیشی کا اندرا پر کوئی اثر نہیں ہوتا ۔ تو وہ اسے بدنام کرنا چاہتی ہے ۔

وہ اپنا بیش قیمت کنگن موقعہ پا کر اس کے طنبورے کے نیچے چھپا دیتی ہے۔ اور ذرا دیر بعد اسے تلاش کرنے لگتی ہے۔ ادھر ادھر ڈھونڈتی ہوئی وہ اندرا کے پاس آتی ہے۔ اور طنبورے سے کنگن نکال لیتی ہے۔ اندرا شرمندہ ہو کر رونے لگتی ہے۔ کنیزیں پدما سے بہت خوش ہیں۔ کیونکہ پدما انہیں انعام دیتی رہتی ہے۔ وہ سب اندرا سے بدگمانی ظاہر کرتی ہیں۔ لیکن اسی وقت گیان سنگھ آ جاتا ہے۔ اور اس واقعہ کی خبر پا کر اندرا کو موردِ الزام نہیں ٹھہراتا۔ اسے اس معاملہ میں فتنہ انگیزی اور شرارت نظر آتی ہے۔ اندرا کی طرف سے وہ کسی قسم کی بدنیتی کا خیال ہی دل میں نہیں لا سکتا۔ اس کا رُخ دیکھ کر کنیزیں بھی اسی کی ہاں میں ہاں ملاتی ہیں۔ اور رانی صاحبہ پدما کو سخت سُست کہتی ہیں۔ پدما دانت پیس کر رہ جاتی ہے۔

ادھر ہری ہر شاہی محل کی دیوار کے نیچے خود فراموشی کی حالت میں کھڑا ہے، کہ شاید اندرا کی آواز کانوں میں پڑ جائے۔ یہاں سے مایوس ہو کر وہ پھر اندرا کی کٹی میں جاتا ہے۔ اور اس کی ایک ایک چیز کو لے کر چومتا اور روتا ہے۔

دوسرے دن محل میں پھر محفل آراستہ ہوتی ہے۔ آج مہاراجہ صاحب جر دل بھی رونق افروز ہیں۔ اتفاق سے سانگی کے کنور صاحب بھی تشریف لائے ہوئے ہیں۔ ان چودہ پندرہ برسوں میں انہوں نے بڑے بڑے صدمے اُٹھائے ہیں۔ ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے۔ بیوی اور بیٹی کی یاد میں بہت لاغر ہو گئے ہیں۔ مگر آرائش کا شوق ابھی تک قائم ہے۔ اب بھی وہی سجے پوری صافہ ہے۔ وہی نیچی اچکن، وہی امرت سری جوتا، اسی

طرح بال سنوارے ہوئے، حالانکہ ان ظاہری آرائشوں کے نیچے روتا ہوا دل ہے اندرا جس وقت محو ہو کر گاتی ہے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ انہیں اندرا کی صورت میں اپنی جنت نصیب بیوی کا عکس نظر آتا ہے۔ پہلی بار جب انہوں نے اندرا کی ماں کو نویلی دلہن کے روپ میں دیکھا تھا۔ اس وقت وہ ہو بہو ایسی ہی تھی۔ اتنی مشابہت آج تک انہوں نے کسی عورت میں نہیں دیکھی۔ جب اندرا یہاں سے جانے لگتی ہے، تو وہ کئی قدم اس کے ساتھ جاتے ہیں۔ اور موقعہ پاکر اس کا نام، اور اس کے والدین کا حال پوچھتے ہیں۔ اندرا اپنے بچپن کا واقعہ ان سے بیان کرتی ہے۔ کنور صاحب کو یقین ہو جاتا ہے، کہ اندرا میری ہی کھوئی ہوئی بیٹی ہے ان کے دل میں بے اختیار ولولہ اُٹھتا ہے، کہ اسے گلے سے لگالیں، مگر شرم مانع ہوتی ہے۔ کیا خبر یہ کس کس کے ساتھ رہی۔ اس پر کیا کیا گذری۔ وہ اسے اپنی لڑکی کیسے تسلیم کر سکتے ہیں؟ اندرا بھی غور سے ان کے چہرے کو دیکھتی ہے۔ اور اسے کچھ کچھ یاد آتا ہے، کہ اس کے باپ کی شکل ان سے ملتی تھی۔ لیکن وہ بھی شرم سے اس کا اظہار نہیں کرتی، کہ کنور صاحب انکار کر دیں، تو خفت ہو۔

راجہ صاحب جردل اندرا کے کیرتن سے اتنے خوش ہوتے ہیں، کہ اسے پانچ موضع معافی عطا کر دیتے ہیں۔ اندرا ان کے قدموں پر گر کر احسان مندی کا اظہار کرتی ہے۔

۱۰

راجکمار اپنی کشتی آراستہ کرتا ہے۔ اور اندرا کو دریا کی سیر کے لئے لے جاتا ہے۔ اندرا اس موقع کی منتظر ہے، کہ راج کمار سے ہری ہر کی

سفارش کر کے اسے درباری شاعر کا رتبہ دلائے۔ اس لئے باوجودیکہ اس کا دل یہاں سے جانے کے لئے بے تاب ہے۔ اور ہری ہر کی جُدائی اسے شاق گذر رہی ہے۔ مگر وہ جانے کا نام نہیں لیتی۔ دریا کی سیر میں شاید وہ موقعہ ہاتھ آجائے۔ اس لئے وہ اس تجویز کو خوشی سے منظور کر لیتی ہے۔ کشتی لہروں پر خوش فعلیاں کر رہی ہے۔ اندرا ہری ہر کا ایک پد گانے لگتی ہے۔ دفعتاً اسے کنارے پر ہری ہر کھڑا نظر آجاتا ہے۔ اس کی صورت سے ایسی مایوسی برس رہی ہے، گویا یہ دائمی مفارقت ہے۔

راجکمار کا دل اس پریم کے پد سے مدہوش ہو جاتا ہے۔ اسے اب صبر کی تاب نہیں رہتی۔ وہ اندرا کے روبرو اپنے دل بے تاب کی داستان سناتا ہے۔ وہ اپنا دل اس کی نذر کرتا ہے۔ اندرا کو اب معلوم ہوتا ہے، کہ وہ ایک سنہرے جال میں پھنس گئی ہے۔ اب ہری ہر کا نام بھی زبان پر لانا قہر ہو جائے گا۔ راج کمار فوراً ہری ہر کے خون کا پیاسا ہو جائے گا۔ وہ دل میں افسوس کرتی ہے، کہ ناحق راجکمار کی دعوت قبول کی۔ یہ ہوس کا پہلا تازیانہ ہے جو اس پر پڑا۔ وہ اب یہ بھی سمجھنے لگی ہے، کہ گو راج کمار اس کے روبرو سائل کی حالت میں کھڑا ہے۔ مگر فی الواقع وہ اس کی قید میں ہے۔

وہ کہتی ہے" راج کمار، میں غریب عورت ہوں۔ اس قابل نہیں کہ تمہاری رانی بنوں۔ تم بدنام ہو جاؤ گے۔ اور عجب نہیں، کہ راجہ صاحب اور تمہاری ماتاجی بھی تم سے ناراض ہوں۔ اس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔ میں تمہیں مصیبتوں میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی"۔

راجکمار" میں تمہارے لئے تخت و تاج پر لات مار دوں گا۔ اندرا مجھے

کسی کی خوشی یا ناخوشی کی پروا نہیں ہے۔ میں تمہارے لئے سب کچھ کرنے کو حاضر ہوں۔"

اندرا بہانہ کرتی ہے، کہ اس نے سنیاس برت دھارن کر لیا ہے۔ اور اگر اس نے عہد کی خلاف ورزی کی، تو ان مہاتماجی کو کتنی تکلیف ہوگی، جنہیں وہ اپنا گورو سمجھتی ہے۔ سورگ میں بھی انہیں اس کی یہ حرکت دل شکستہ کر دے گی۔ وہ راج کمار کی عزت کرتی ہے۔ لیکن محبت کرنا اس کے لئے ممنوع ہے۔ اور وہ اپنے عہد کو توڑ نہیں سکتی۔

راجکمار: "تمہیں میرے اوپر مطلق رحم نہیں آتا اندرا؟"

اندرا: "میں اپنے عہد کو توڑ کر زندہ نہیں رہ سکتی۔"

راجکمار: "یہ سب حیلے ہیں۔ اندرا۔ کیا میں خیال کروں۔ تمہارے دل میں کسی دوسرے کے لئے جگہ ہے؟"

اندرا: "میں نے آپ سے کہدیا، میں سنیاسی ہوں۔"

راجکمار: "یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟"

اندرا: "ہاں آخری۔"

راجکمار مایوسی کے عالم میں کمر سے تلوار نکال کر اپنے سینہ میں چبھونا چاہتا ہے۔ اندرا تیزی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے:

راجکمار: "مجھے مر جانے دو اندرا۔ جب میں تمہیں زندگی میں نہیں پا سکتا، تو زندگی بےکار ہے۔"

اندرا اس کی کمر میں تلوار لگاتی ہوئی دلجوئی کے لئے کہتی ہے۔ "میرے جیسی ہزاروں عورتیں آپ کو ملیں گی۔ ایک غریب تپسونی کا پریم آپ کو مل بھی جائے۔ تو آپ کو اس سے تشفی نہ ہوگی۔"

راج کمار کا چہرہ مسرت سے کھل جاتا ہے۔ کہتا ہے۔" محبت تو عہد اور برت کی پروانہیں کرتی"

اندرا۔" لیکن محبت چھو منتر سے پیدا ہونے والی چیز بھی تو نہیں، جو محبت ایک نگاہ سے پیدا ہو سکتی ہے۔ وہ ایک نگاہ میں فنا بھی ہو سکتی ہے تم راج کمار ہو۔ مجھے کیا بھروسہ، کہ مجھ سے زیادہ حسینہ اور جمیلہ عورت پا کر تم میری طرف سے آنکھیں پھیر نہ لوگے۔ پھر تو میں کہیں کی بھی نہ رہوں گی۔ وصالِ صنم کے لئے خدا کو چھوڑ کر اگر نامراد رہوں، تو کیا ہو؟"

راجکمار۔" ہاں تمہاری یہ شرط مجھے منظور ہے۔ اندرا مجھے موقعہ دو، کہ میں اپنی محبت کا نقش تمہارے دل پر جما سکوں۔ لیکن اگر تم مجھ سے منہ موڑ کر چلی گئیں، تو دیکھ لینا، اسی دن تمہیں میرے مرنے کی خبر ملے گی"

اندرا دیکھتی ہے کہ ہری ہر آہستہ آہستہ دریا کے کنارے سے بستی کی طرف چلا جا رہا ہے۔ اپنی بے کسی اور مایوسی کا خیال کر کے اس کی آنکھیں آبگوں ہو گئیں۔

۱۱

پدما آسانی سے اپنی آرزوؤں کا خون ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ وہ اندرا کے متعلق تحقیقات شروع کرتی ہے۔ کہ شاید کوئی ایسا پہلو ہاتھ آجائے، جس کی بنا پر وہ اسے راجکمار کی نظروں سے گرا دے۔ ایک دن وہ اس کی قیام گاہ کا پتہ دریافت کرتی اس کی کٹی تک جا پہنچتی ہے۔ وہاں ہری ہر سے اس کی ملاقات ہو جاتی ہے۔ باتوں باتوں میں وہ اندرا کی بیوفائیوں کی داستان ہری ہر سے بیان کرتی ہے۔ اس نے کئی تصویریں

اثر والی ہیں۔ جن میں اندرا کا راجکمار کے ساتھ سیر کرنا، گانا بجانا، لکھنا پڑھنا، نظر آتا ہے۔ وہ کہتی ہے، کہ اندرا وہاں ایسی خوش ہے، گویا اُسے کائنات کی دولت مل گئی ہو۔ اور تم اس کے فراق میں گھُل رہے ہو۔ ایسی بے وفا عورت اسی قابل ہے، کہ اس کی قلعی کھول دی جائے۔ تاکہ وہ کہیں اپنا روئے سیاہ نہ دکھا سکے۔ لیکن ان بدگوئیوں کا ہری ہر پر مطلق اثر نہیں ہوتا۔ آخر ادھر سے مایوس ہو کر پدما ایک دوسرا جال پھیلاتی ہے۔ وہ ہری ہر کو اپنے ساتھ دربار میں لاتی ہے۔ اور راجکمار سے اس کا تعارف کراتی ہے۔ راج کمار اس کا کلام سُن کر بہت محظوظ ہوتا ہے۔ یہ وہی کلام ہے، جو اس نے اندرا کے منہ سے سُنا ہے۔ راج کمار اس کی بڑی خاطر کرتا ہے۔ پدما ہری ہر کی زبان سے ایسے الفاظ نکلوانا چاہتی ہے۔ جو اس کی محبت کا پردہ فاش کر دیں۔ اور راج کمار کو معلوم ہو جائے، کہ یہ اندرا کا عاشق ہے۔ لیکن ہری ہر اتنا محتاط ہے، کہ وہ ایک لفظ بھی ایسا منہ سے نہیں نکلنے دیتا، جس سے محبت کا اظہار ہو۔ راج کمار اندرا کی تعریف کرتا ہے۔ ہری ہر اس طرح سنتا ہے، گویا اس نے اندرا کا نام بھی نہیں سنا۔ پدما اسی وقت رنواس میں جا کر اندرا کو اپنے ساتھ لاتی ہے۔ اسے یقین ہے۔ کہ دونوں بر وقت ملاقات ضرور ایسے خوش ہو جائیں گے کہ اس ضعیف بنیاد پر کوئی تعمیر کھڑی کی جا سکے گی۔ لیکن اندرا ہری ہر کو دیکھ کر بیگانہ وار پیش آتی ہے۔ اور ہری ہر بھی اس سے زیادہ مخاطب نہیں ہوتا۔ تب پدما ایک مشاعرہ منعقد کرتی ہے۔ اور اس میں ریاست کے بڑے بڑے خوش گو شعراء کو مدعو کرتی ہے۔ یہ تجویز پیش کی جاتی ہے، کہ جس کا کلام بہتر ہو، اسے درباری شاعر کا

منصب عطا کیا جائے۔ پدما کو یقین ہے کہ ہری ہر کا کلام گوئے سبقت لیجائیگا۔ اس لئے وہ اندرا کو منصف قرار دیتی ہے۔ راج کمار بھی بڑی خوشی سے اندرا کا منصف بنایا جانا منظور کرتا ہے۔ اندرا کو اب صاف نظر آرہا ہے، کہ اس کی تباہی کے سامان کئے جا رہے ہیں۔ ہری ہر کا کلام یقیناً بہترین ہوگا۔ اور اسے مجبوراً اسی کو فائق کہنا پڑے گا۔ ہری ہر کی حمایت یا سفارش میں ایک لفظ بھی منہ سے نکالنا اس کے لئے زہر قاتل کا کام دے سکتا ہے اس کے فیصلہ پر اعتراض کرنا، اور ہری ہر کے کلام میں نقائص نکال کر راج کمار کو اندرا سے بدظن کر دینا مشکل نہ ہوگا۔ وہ چاہتی ہے کہ اگر موقعہ ملے، تو ہری ہر کو آگاہ کر دے۔ مگر یہ موقع اسے نہیں ملتا۔

پدما مشاعرہ کی تیاریوں میں مصروف رہتی ہے۔ مقررہ تاریخ کو سبھی شاعر تشریف لاتے ہیں۔ ہری ہر بھی آتا ہے۔ شرط تازہ کلام کی ہے۔ ہری ہر نے کوئی تازہ نظم نہیں لکھی۔ اور شعراء اپنے کلام سناتے ہیں۔ نعرۂ تحسین بلند ہو جاتا ہے۔ بالآخر جب ہری ہر کی باری آتی ہے۔ تو وہ صاف کہہ دیتا ہے، میں نے کوئی تازہ نظم نہیں لکھی۔ اس نے بھی پدما کی ان سرگرمیوں کو اپنی فراست سے تاڑ لیا ہے۔ اور اس کے جال میں نہیں پھنسنا چاہتا۔ اندرا اسے تائید غیبی سمجھ کر پرماتما کا دل میں شکریہ ادا کرتی ہے۔ انعام اور منصب ایک دوسرے شاعر کو مل جاتے ہیں۔ اور اندرا کی محبت کا راز سربستہ رہ جاتا ہے۔ ہری ہر یہاں سے خوش خوش رخصت ہوتا ہے۔ اندرا بھی رنو اس میں خوش و خرم ہے۔ اس سے زیادہ مسرت کی بات اس کے لئے اور کیا ہو سکتی ہے۔

۱۲

راج کمار گیان سنگھ کی گدی نشینی کا جشن منایا جا رہا ہے۔ شہر میں چراغاں ہو رہا ہے۔ چورستوں پر عالی شان پھاٹک بنائے گئے ہیں۔ جن پر نوبت بج رہی ہے۔ شاہی محلات اور دفاتر خوب آراستہ کئے گئے ہیں۔ صدر پھاٹک سے چوک تک دو رویہ بجلی کے خوشرنگ بلب لگائے گئے ہیں۔ کنارے کے درختوں پر بجلی کی روشنی کے حروف میں دعائیہ کلمات لکھے گئے ہیں۔ پنڈت لوگ مہورت دیکھتے ہیں۔ اسی وقت گیان سنگھ محل سے نکل کر عالی شان منڈپ میں آتا ہے۔ جو اسی تقریب کے لئے نصب کیا گیا ہے۔ اراکین دربار اور رؤسا نذرانے پیش کرتے ہیں۔ گیان سنگھ اٹھ کر اپنے طرز عمل کا اعلان اور ملازمین شاہی و نیز رعایا کو اپنے فرائض کی پابندی کی ہدایت کرتا ہے۔ اسامیوں کا نصف لگان اس نے معاف کر دیا ہے۔ اس لئے رعایا بے حد خوش ہے۔ سب اظہار مسرت کر کے اس کو دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوتے ہیں۔ پھر غرباء کو کھانا تقسیم کیا جاتا ہے۔ قیدیوں کی رہائی کا حکم ہوتا ہے۔ تب فوجوں کی سلامی اور قواعد ہوتی ہے۔ بینڈ بجتا ہے۔ افسروں کو تمغے اور پروانے ملتے ہیں۔ پھر آتش بازیاں چھوڑی جاتی ہیں۔ اس کے بعد ٹھاکر دوارے میں کیرتن ہوتا ہے۔ ہری ہر وہاں اندرا کے درشنوں کے اشتیاق میں آیا ہے۔ مگر کیرتن کرنے والوں میں اندرا نہیں ہے۔ طوائفوں کو مطلق مدعو نہیں کیا گیا۔ جیسا عام دستور تھا۔ گیان سنگھ نے اس تقریب میں بھی بے جا صرف نامنظور کر دیا ہے۔ شہر میں خبر گرم ہے، کہ اندرا کی شادی گیان سنگھ سے ہوگی۔ ایسی مہربان، غریب پرور، ہر دل عزیز رانی پانے سے ہر خاص و عام خوش

سے ہے۔

کیرتن کے بعد گیان سنگھ اندرا کے پاس جاتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ اندرا کیا ابھی تمہارا امتحان پورا نہیں ہوا؟

اندرا کہتی ہے "ابھی نہیں۔ مجھے اس رتبہ کے قابل بننے دیجئے"

راجکمار۔ "اس تقریب کی یادگار میں محبت کا ایک تحفہ پیش کرتا ہوں"

اندرا: "محبت کا کوئی تحفہ ابھی میرے لئے منع ہے"

راجکمار: "تم بڑی بے رحم ہو اندرا"!

اندرا: "اور ایسی بے رحم عورت کو آپ رانی بنانا چاہتے ہیں۔ رانی کو رحمدل ہونا چاہیئے"

راجکمار: "ساری دنیا کے لئے تو تم رحم کی دیوی ہو۔ لیکن میرے لئے پتھر کی مورت"

گیان سنگھ اب اندرا کے ہاتھوں میں ہے۔ روح وہ ہے جسم گیان سنگھ۔ اندرا کو رعایا کے حقوق کا خیال ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں بھولتا۔ آئے دن نئے نئے فرمان جاری ہوتے ہیں۔ جن میں رعایا کی ضرورتوں کے لئے کوئی نہ کوئی نیا حق عطا کیا جاتا ہے۔ شاہی اخراجات کم کئے جاتے ہیں۔ شاہی محل میں بھی وہ نفاست اور شوکت نہیں ہے۔ خادموں کی ایک پوری فوج تھی۔ انہیں جواب دے دیا جاتا ہے۔ حسین لونڈیوں کا بھی ایک قافلہ تھا۔ انہیں بھی جواب مل جاتا ہے۔ محلات کے کئی حصے رعایا کی ضرورتوں کے لئے علیحدہ کر دئے جاتے ہیں۔ ایک محل میں کتب خانہ کھل جاتا ہے۔ دوسرے میں شفاخانہ۔ ایک پوری عمارت کسانوں اور مزدوروں کے لئے وقف

کر دی جاتی ہے۔ جہاں ان کی پنچائتیں ہوتی ہیں۔ اور طرح طرح کے زرعی آلات کی نمائش کی جاتی ہے۔ فوج کے ایک بڑے حصّے کو موقوف کر دیا جاتا ہے اس کی جگہ رعایا میں سے نوجوان چن لئے جاتے ہیں۔ اور قومی فوج فوراً آراستہ کی جاتی ہے۔ نوجوانوں کے لئے ورزش گاہیں تعمیر کی جاتی ہیں۔ گیان سنگھ ملوکیت کی آب وہوا میں پلا ہوا شہزادہ ہے۔ اس کا حکم رعایا کے لئے قانون ہو سکتا تھا۔ اب وہ قدم قدم پر اپنے اوپر بندشیں عاید کرتا ہے۔ یہ سب اندرا کی تحریک کا اثر ہے۔ اندرا جو فرمان لکھتی ہے۔ اس پر وہ آنکھیں بند کر کے دستخط کر دیتا ہے۔

ادھر امراء اور اراکین دربار کے حلقہ میں بڑی تشویش پھیلتی ہے۔ ان کے خیال میں ریاست تباہ ہوئی جاتی ہے۔ گیان سنگھ کی یہی حالت رہی تو تھوڑے دنوں میں امراء کا خاتمہ ہو جائے گا۔ حرّیت کے اس سیلاب کو روکنے کی سازشیں کی جاتی ہیں۔ پدما اس سازش کی روح رواں ہے۔ یہ لوگ تخفیف شدہ فوج کے سپاہیوں، اور برخاست شدہ شاہی ملازموں میں بدگمانیاں پھیلاتے ہیں۔ اُمراء میں بھی شورش پیدا کرتے ہیں۔ گیان کو بزور شمشیر زیر کر کے کسی دوسرے راجہ کو بٹھانا چاہتے ہیں۔ پدما کا اس سازش سے صرف یہی منشاء ہے، کہ اندرا ذلیل اور بدنام ہو۔ وہ اس کو بدنام کرتی ہے۔ اور ان سارے تغیرات کا واحد سبب اندرا ہی کو ٹھہراتی ہے۔ اس لئے باغیوں کی یہ جماعت اس کی جان کی دشمن ہو جاتی ہے۔ مسلح شورش کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔

گیان سنگھ اور اندرا شاہی محل کے ایک مختصر سے کمرہ میں بیٹھے شطرنج کھیل رہے ہیں۔ کمرہ میں کوئی تکلف یا آرائش نہیں ہے۔ اندرا نے آج یہ بازی

لگائی ہے، کہ اگر وہ جیت جائے گی، تو راجہ سے جو چاہے گی، طلب کرے گی۔ راجہ کو اس کی تعمیل میں انکار نہ ہوگا۔ اور راجہ کو بھی یہی اختیار ہوگا۔ دونوں اپنے اپنے خیال میں خوش ہیں۔ گیان سنگھ کی خوشی کا وار اپار نہیں ہے۔ وہ آج اپنی کامیابی کے یقین سے پھولا نہیں سماتا۔ دونوں خوب دل لگا کر کھیل رہے ہیں۔ پہلے راجہ صاحب غالب آتے ہیں۔ اور اندرا کے کئی مہرے پیٹ لیتے ہیں۔ ان کی مسرت ہر لمحہ بڑھتی جاتی ہے۔ دفعتاً بازی پلٹ جاتی ہے۔ راجہ کے بادشاہ پر شہ پڑ جاتی ہے۔ اور اس کا فرزین پٹ جاتا ہے۔ پھر تو ایک ایک کر کے اس کے سبھی مُہرے غائب ہو جاتے ہیں۔ اور وہ ہار جاتا ہے۔ اس کے چہرہ پر مایوسی چھا جاتی ہے۔ اندرا اسی وقت ایک فرمان نکالتی ہے اور راجہ سے اس پر دستخط کرنے کی استدعا کرتی ہے۔ راجہ دبی ہوئی نظروں سے فرمان کو دیکھتا ہے۔ غلّہ کا محصول درآمد معاف کر دیا گیا ہے۔ جس سے شاہی محاصل میں ایک معتدبہ رقم کی کمی ہو جاتی ہے ریاست میں غلہ بہت کم ہوتا ہے۔ غلہ زیادہ تر دیگر ملکوں سے آتا ہے۔ اس پر درآمد محصول کے باعث غلہ گراں ہو جاتا تھا۔ اور رعایا کو تکلیف ہوتی تھی۔ اندرا غربا کو ارزاں غلّہ بہم پہنچانے کی فکر میں تھی۔ اور آج موقعہ پا کر اس نے یہ فرمان پیش کیا۔ گیان سنگھ کو تامل تو ہوتا ہے۔ مگر زبان ہار چکا ہے۔ فرمان پر دستخط کر دیتا ہے۔

اس وقت باہر ایک شور برپا ہوتا ہے۔ ایک سنتری دوڑا ہوا آتا ہے۔ اور اطلاع دیتا ہے، کہ باغیوں نے شاہی محل کو گھیر لیا۔ اندر اندر گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

(۱۳)

گیان سنگھ کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہو جاتا ہے۔ وہ فوراً اسلحہ سے آراستہ ہو کر اندرا سے رخصت ہوتا ہے۔ اور فصیل کے اوپر چڑھ کر بلند آواز میں شورش کرنے والوں کو مخاطب کر کے اس شورش کا سبب پوچھتا ہے۔

ایک آدمی نیچے سے جواب دیتا ہے۔" ہم یہ مظالم برداشت نہیں کر سکتے۔ اندرا ہماری تباہی کا باعث ہے۔ وہ ہماری رانی نہیں بن سکتی۔"

گیان سنگھ اندرا کے احسانات' جو اس نے قوم پر کئے ہیں۔ بیان کرتا ہے۔ مگر نیچے سے وہی جواب آتا ہے۔" اندرا ہماری تباہی کا باعث ہے۔ وہ ہماری رانی نہیں بن سکتی۔" گویا کوئی گراموفون کی صدا ہو۔

گیان سنگھ تب وہ فرمان نکال کر پڑھنا شروع کرتا ہے۔ جس پر اس نے ابھی دستخط کئے ہیں۔ مگر اس کا بھی باغیوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ پھر وہی رٹ لگائی جاتی ہے۔" اندرا ہماری رانی نہیں بن سکتی۔ وہ ہماری تباہی کا باعث ہے۔" اس کے ساتھ ہی باغی لوگ زینوں سے فصیل پر چڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ صدر دروازہ بند کر دیا جاتا ہے۔

گیان سنگھ اب غضبناک ہو کر دھمکیاں دیتا ہے۔ مگر اس کی فہمائش کی طرح دھمکیاں بھی مجمع پر کوئی اثر نہیں کرتیں۔ وہ برابر فصیل پر چڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

گیان سنگھ طیش میں آکر خطرے کے گھنٹے کے پاس جاتا ہے۔ اور اسے زور سے بجاتا ہے۔ فوج کے سپاہی سنتے ہیں۔ مگر نکلتے نہیں۔ دوسری بار گھنٹہ بجتا ہے۔ سپاہی تیار ہوتے ہیں۔ اور جلد جلد اسلحہ جمع کرنے لگتے ہیں۔ تیسرا گھنٹہ ہوتا ہے۔ سب فوج نکل پڑتی ہے۔ اسی وقت پدما آکر انہیں

بھکاتی ہے۔" نادانو، کیوں اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارتے ہو۔ کیا اب تک تمہاری آنکھیں نہیں کھلیں۔ تمہارے کتنے ہی بھائی علیحدہ کر دئے گئے۔ اور آج وہ دربدر ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ تم لوگوں کی باری بھی بہت جلد آئی جاتی ہے۔ اگر یہی لیل و نہار ہیں، تو دو چار مہینے میں سب کے سب نکال دئے جاؤگے۔ یہ باغی کون ہیں؟ یہ وہی تمہارے بھائی ہیں۔ جنہیں گیان سنگھ کی نئی بن بیاہی رانی اندرا نے نکال دیا ہے۔ ایک بازاری طوائف تمہارے اوپر اس طرح حکومت کر رہی ہے۔ کیا تم لوگ اسے برداشت کر سکتے ہو؟"

اس تقریر کا یہ اثر ہوتا ہے کہ سپاہی واپس چلے جاتے ہیں۔ اور اپنے اسلحہ کھول کر رکھ دیتے ہیں۔

اس وقت پدما اندرا کے پاس آ کر دوستانہ مشورہ دیتی ہے "اندرا بھاگ جاؤ۔ ورنہ تمہاری جان خطرے میں ہے" اندرا اس موقعہ کو غنیمت سمجھتی ہے اور پدما کا احسان مانتی ہے۔ پدما اسے ایک چور دروازہ سے لے جاتی ہے۔ جو شہر کے باہر ایک مندر میں کھلتا ہے۔ ایسے ہی نازک موقعوں کے لئے وہ سُرنگ بنائی گئی ہے۔ پدما نے ہری ہر کو پہلے ہی بلا لیا ہے۔ اس کے ساتھ دو گھوڑے ہیں۔ چاروں طرف اندھیرا ہے۔

ہری ہر ایک گھوڑے پر اندرا کو سوار کراتا ہے۔ دوسرے پر خود بیٹھتا ہے۔ اور دونوں شہر کی اندھیری سڑکوں پر ہوتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔

اسی وقت پدما فصیل پر آ کر گیان سنگھ کے بغل میں کھڑی ہو کر کہتی ہے۔ "بہادرو، میں تمہیں مژدہ سُناتی ہوں، کہ اندرا اب اس محل میں نہیں ہے تم میں سے کوئی ایک معتبر آدمی قصر شاہی میں آ کر اپنا اطمینان کر سکتا ہے۔

وہ جس گمنامی سے نکلی تھی۔ اسی میں پھر چلی گئی ہے۔ اب تم لوگ واپس جاؤ۔ میں تم لوگوں کو اطمینان دلاتی ہوں، کہ تم لوگوں کے سر سے یہ احکام ہٹا لیئے جائیں گے۔"

گیان سنگھ زخم خوردہ طائر کی طرح ایک ٹھنڈی سانس لے کر گر پڑتا ہے۔ باغیوں کی جماعت لوٹ جاتی ہے۔ اور گیان سنگھ کو اس شورش سے نجات دلانے کی نیکنامی پدما کو ملتی ہے۔

گیان سنگھ مایوسانہ لہجہ میں پوچھتا ہے "اندرا کہاں چلی گئی؟"

پدما۔"جہاں سے آئی تھی، وہیں چلی گئی۔ اگر تم سمجھتے ہو، کہ اسے تم سے محبت تھی، تو تم غلطی پر ہو۔ وہ یہاں بدرجہ مجبوری پڑی تھی۔ اس کا عاشق وہی بدنصیب شاعر ہری ہر ہے۔ اسی پر وہ جان دیتی ہے۔ اس کو کوئی منصب دلانے کی فکر میں وہ یہاں پڑی ہوئی تھی۔ جب اس نے دیکھا، کہ یہاں خطرہ ہے۔ تو بھاگ نکلی، بے وفا تھی۔"

گیان سنگھ نیم جانی کی حالت میں اندر آتا، اور اسی غیظ میں اندرا کی ہر ایک چیز کو پیروں سے کچل ڈالتا ہے۔ عشق ناکام ہو کر حسرت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اندرا کی کئی تصویریں دیواروں پر لگی ہوئی ہیں۔ گیان سنگھ ان تصاویر کو اُتار کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا ہے۔ پدما اس وقت تحمل اور عفو کی دیوی بنی ہوئی ظاہر میں اس کے غصّہ کو فرو کر رہی ہے۔ مگر باتیں ایسی چوٹ کرنے والی کہتی ہے۔ کہ گیان سنگھ کی آتش حسد اور بھی مشتعل ہو جاتی ہے۔ وہ اس طنبورے کے سینکڑوں ٹکڑے کر ڈالتا ہے۔ دفعتاً اسے ایک بات یاد آجاتی ہے۔ وہ فوراً باہر آتا ہے۔ اور کئی معتبر سپاہیوں کو اندرا کا تعاقب کرنے کے لئے روانہ کر دیتا ہے۔ اور حکم دیتا ہے، کہ شہر کے سب ناکے بند کر

دئے جائیں۔

پھر اندر جا کر اندرا کی پوجا کی چیزیں اور ٹھاکر جی کا سنگھاسن سب اُٹھا اُٹھا کر پھینک دیتا ہے۔ جو کنیزیں اندرا کی خدمت پر مامور تھیں، انہیں نکال دیتا ہے۔ اور ایک جنون کے عالم میں پیر پٹکتا ہوا بار بار اندرا کو کوستا ہے۔ "مکّارہ، عیّارہ، ساحرہ، بے وفا، دغا شعار۔"

پدما ٹھنڈے پانی کا گلاس لا کر اسے دیتی ہے۔ وہ ایک ہی سانس میں اسے خالی کر کے گلاس کو پٹک دیتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں۔ نتھنے پھڑک رہے ہیں۔ پدما اُسے پنکھا جھلنے لگتی ہے۔ ان دل جوئیوں سے راجہ کا دل پدما کی طرف سے نرم ہو جاتا ہے۔ وہ اسے ضبط اور وفا کی دیوی خیال کرنے لگتا ہے۔ احسان مندی کا احساس بھی کچھ کم نہیں ہے۔ پدما اگر آڑے نہ آتی، تو باغیوں نے محل پر قبضہ کر لیا ہوتا۔ اور معلوم نہیں اس کے سر پر کیا آفت آتی۔ وہ اس سے اپنی گذشتہ فرو گذاشتوں کی معافی مانگتا ہے۔ اور پہلی بار اس کی محبت کا جلوہ اس کے دل میں جاگزیں ہوتا ہے۔ اس مایوسی اور غم کی حالت میں پدما ہی اسے نجات کی دیوی نظر آتی ہے۔ وہ اسے گلے سے لگا لیتا ہے۔ پدما فرطِ محبت سے اس کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگتی ہے۔

۱۴

اندرا اور ہری ہر گھوڑوں پر سوار شہر پناہ کے ایک دروازے پر پہنچتے ہیں۔ دروازہ بند ہے۔ دوسرے دروازے پر آتے ہیں۔ وہ بھی بند ہے ہری ہر کو معلوم ہے، کہ فصیل میں ایک شگاف ہے۔ اس پر گھاس پھوس جمی ہوئی ہے۔ اور کسی کو شاید اس شگاف کی خبر بھی نہ ہو۔ دونوں اسی شگاف

کے اندر گھوڑے ڈال دیتے ہیں۔ اور کانٹوں سے اُلجھتے گھاس پھوس کے ڈھیروں کو ہٹاتے بمشکل شگاف کو پار کرتے ہیں۔ مگر باہر کی طرف شہر پناہ سے ملی ہوئی ندی آتی ہے۔ مجبوراً دونوں ندی میں گھوڑے ڈال دیتے ہیں۔ اور تیرتے ہوئے ندی کے پار ہو جاتے ہیں۔ دوسری جانب پہنچ کر دونوں ذرا دم لیتے ہیں۔ اور تب پھر بھاگتے ہیں۔ بہت دور چلنے کے بعد انہیں ایک مندر ملتا ہے۔ دونوں وہیں گھوڑے کھول دیتے ہیں۔ اور رات بسر کرتے ہیں۔ صبح کو دونوں وہاں سے پیادہ پا روانہ ہوتے ہیں۔ اور دوپہر ہوتے ہوتے ایک بڑے گاؤں میں پہنچتے ہیں۔ وہاں گاؤں کا زمیندار برات لے کر اپنی شادی کرنے جا رہا ہے۔ ہزاروں آدمی جمع ہیں۔ دوسرے موضعوں کے لوگ بھی تماشا دیکھنے آئے ہیں۔ برات چلنے کو تیار ہے۔ دولھا گھر سے نکل کر موٹر پر بیٹھتا ہے۔ اور موٹر چلنا چاہتی ہے۔ کہ ایک عورت آکر موٹر کے سامنے لیٹ جاتی ہے۔ یہ زمیندار صاحب کی پہلی بیوی ہے جسے انہوں نے پندرہ سال سے چھوڑ رکھا ہے۔ آج وہ اپنی شادی کرنے جاتے ہیں۔ تو بیوی ان کے راستہ میں حائل ہو جاتی ہے۔ میاں بیوی میں سخت کلامیوں کی نوبت آتی ہے۔ شوہر بیوی کو دھمکا کر راستہ سے ہٹ جانے کا حکم دیتا ہے۔ بیوی پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ تب وہ غصہ میں آکر موٹر چلا دیتا ہے۔ عورت کچلی جاتی ہے۔ اس وقت ہزاروں آدمی غضبناک ہو کر زمیندار صاحب پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اور اسے مار ڈالتے ہیں۔ اندرا اور ہری ہر افسوس کرتے ہیں، کہ اور پہلے یہاں نہ پہنچے۔ ورنہ شاید سمجھا بجھا کر دونوں میں میل کرا دیتے۔ ذرا دیر اس گاؤں میں ٹھہر کر دونوں پھر آگے بڑھتے ہیں۔ جہاں ناچ ہو رہا ہے۔ اندرا وہاں گاتی ہے۔ اور انہیں لوگوں کے ساتھ

رات بسر کرتی ہے۔

کئی دن کے بعد دونوں اس ریاست کی حدود سے باہر نکل جاتے ہیں اور سانگلی کی ریاست میں پہنچتے ہیں۔ یہیں دونوں ایک گاؤں میں رہنے لگتے ہیں۔ دونوں گاؤں کی خدمت کرتے ہیں۔ اور ان کی خدمت سے گاؤں والے بڑے خوش ہیں۔

گاؤں میں ایک ٹھاکر دوارہ ہے۔ وہیں دونوں رات کو کیرتن کرتے ہیں۔ ان کی خدمت اور بھگتی کا شہرہ قرب و جوار کے مواضعات میں پھیل جاتا ہے۔ اور عقیدت مندوں کی تعداد بڑھنے لگتی ہے۔ ان دہقانوں کی نگاہ میں یہ دونوں آسمانی وجود ہیں۔ اور وہ ان کی دل و جان سے پرستش کرتے ہیں۔ نغمہ و شعر کی اس دنیا میں دونوں حقیقی وجود کا جلوہ دیکھتے ہیں۔ اور دنیا دی کدورتیں اور خواہشیں ان کے دلوں سے نکل جاتی ہیں۔ انہیں ہر ایک وجود میں ایک ہی حقیقت کا جلوہ نظر آنے لگتا ہے۔ ہری ہر کبھی کبھی آبشار کے کنارے جا نکلتا ہے۔ اور اس کے نغمہ میں حقیقت کی آواز سنتا ہے۔ اور روحانیت کے جذبات سے اس کا دل لبریز ہو جاتا ہے۔ کبھی کسی جنگلی پھول کو دیکھ کر وہ وجد میں آجاتا ہے۔ اور اس میں معبود کا جلوہ دیکھتا ہے۔

ایک دن سانگلی کے کنور صاحب شکار کھیلنے آتے ہیں۔ ان کے ہمراہی برقنداز اور شکاری وغیرہ خیمے لے کر آپہنچتے ہیں۔ شام کا وقت ہے۔ کنور صاحب اپنے ہاتھی پر گاؤں میں آتے ہیں۔ اور شکار کی تیاریاں ہونے لگتی ہیں۔ اسی وقت اندرا ان کے روبرو جا کر ایک معرفت کا پد گاتی ہے۔ کنور صاحب کے دل میں لڑکی کی محبت تازہ ہو جاتی ہے۔ پہلی بار جب انہوں

نے اندرا کو دیکھا تھا - اسے پہچان گئے تھے - لیکن اس حالت میں اپنی لڑکی کو تسلیم کرنے کی انہیں ہمت نہ ہوئی تھی - تب سے برابر انہیں اپنی پیاری بیٹی کی یاد بے چین کرتی رہتی تھی - لیکن اس دوران میں ان کی محبت ان خیالات پر غالب آ چکی ہے - وہ اب ضبط نہیں کر سکتے - اور اندرا کو سینے سے لگا کر کہتے ہیں - "تو میری کھوئی ہوئی پیاری بیٹی ہے"۔ وہ اسے اپنے ساتھ چلنے کے لئے اصرار کرتے ہیں - مگر ہری ہر ثروت اور تموّل کے جال میں نہیں پھنسنا چاہتا - اسے اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں ثروت میں اندرا کو نہ کھو بیٹھے - اندرا سے وہ کچھ نہیں کہتا - مگر اس کے بشرہ سے اس کی دل کی کیفیت عیاں ہو جاتی ہے - اور اندرا اپنے باپ کے ساتھ جانے سے انکار کرتی ہے - مندر کے سامنے جھونپڑی میں دونوں بیٹھے ہوئے ہیں - گھر میں کوئی سامان نہیں - ادھر شاہی محل میں ثروت ہے - جاہ و حشم ہے - مگر اندرا یہ سب کچھ محبت پر نثار کر دیتی ہے -

۱۵

اندرا کو محل سے نکال کر اور اس کی طرف سے بے فکر ہو کر پدما کی طبعی شرافت جو کچھ دنوں حسد کے باعث پسِ پردہ ہو گئی تھی - نمودار ہو جاتی ہے - اور دل و جان سے گیان سنگھ کی خدمت کرتی ہے - اس یاس و غم کی حالت میں اگر وہ کچھ کھاتا ہے - تو اسی کے اصرار سے - سیر کرنے جاتا ہے، تو اسی کے کہنے سے - ریاست کے کاروبار دیکھتا ہے، تو اسی کے ایما سے - وہ کبھی گیت گا کر، کبھی افسانے سنا کر اس کا دل بہلاتی ہے - لیکن اکثر راتوں کو راجہ کی نیند کھل جاتی ہے - اور اندرا کو یاد کر کے بے تاب ہو جاتا

ہے۔ تب حسد کی آگ اس کے سینہ میں مشتعل ہو جاتی ہے۔ اندرا کسی غیر کی ہو کر رہے۔ یہ خیال اس کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ وہ تپسونی بن کر رہتی تو غالباً اس کے قدموں کی خاک ملتھے پر لگاتا۔ مگر وہ کسی غیر کے پہلو میں ہے۔ یہ خیال کر کے اس کے جسم میں آگ لگ جاتی ہے۔

گیان سنگھ کے مخبر اور جاسوس چاروں طرف چھوٹے ہوئے ہیں۔ ایک دن اسے خبر ملتی ہے، کہ اندرا سانگلی کے ایک موضع میں ہے۔ گیان سنگھ اسی وقت چند آزمودہ سپاہیوں اور جاں نثار رفیقوں کو لے کر اندرا اور ہری ہر کی تلاش میں چل کھڑا ہوتا ہے۔ پدما اسے روکتی ہے۔ منتیں کرتی ہے۔ مگر وہ مطلق پروا نہیں کرتا۔ آخر مجبور ہو کر وہ بھی اس کے ساتھ چل کھڑی ہوتی ہے سبھی آدمی گھوڑوں پر سوار ہیں۔ اور ڈبل چال چل رہے ہیں۔ دشوار گذار پہاڑی راستہ ہے۔ گیان سنگھ اور پدما ہمراہیوں سے بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ دفعتاً کئی مسلح ڈاکوؤں سے ان کا سامنا ہو جاتا ہے۔ پدما اپنے پستول سے دو آدمیوں کو واصل جہنم کر دیتی ہے۔ باقی ڈاکو بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ کئی دن کے بعد یہ جماعت اس موضع میں پہنچ جاتی ہے۔ جہاں اندرا اور ہری ہر اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

دم کے دم میں خبر پھیل جاتی ہے، کہ راجہ گیان سنگھ، اندرا اور ہری ہر کو گرفتار کرنے چڑھ آئے ہیں۔ قرب و جوار کے دہقانی لاٹھیاں، گنڈاسے اور کلہاڑے لے کر آتے ہیں۔ اندرا اور ہری ہر دونوں جماعتوں کے بیچ میں آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انہیں دیکھتے ہی گیان سنگھ تلوار کھینچ کر ان پر جھپٹتا ہے۔ اندرا اور ہری ہر وہیں سر جھکا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور پرماتما کا دھیان کرنے لگتے ہیں۔ قریب ہے کہ تلوار ہری ہر کی گردن پر پڑے، کہ پدما آجاتی

ہے۔ اور لپک کر راجہ کے ہاتھ سے تلوار چھین لیتی ہے۔ دونوں محبت کے شیدائیوں کی یہ جاں بازی اور بے نفسی دیکھ کر گیان سنگھ کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ اس کے دل میں دفعتاً اس روشنی کا ظہور ہوتا ہے۔ جس کے سامنے کمزوریاں اور نفس کی سرکشیاں مٹ جاتی ہیں۔ وہ ایک منٹ تک خاموش کھڑا رہتا ہے۔ پھر اندرا کے قدموں پر گر پڑتا ہے۔ پدما اسے ایک ایسے فعل سے باز رکھ کر، جو راجہ صاحب کی زندگی کا خاتمہ کر دیتا۔ ان کے دل پر فتح پا جاتی ہے۔

گیان سنگھ ایک لمحہ میں اندرا کے قدموں سے اُٹھ کر پدما کو گلے لگا لیتا ہے۔ اندرا بھی پدما کو سینہ سے لگا لیتی ہے۔ پھر ہری ہر اور گیان سنگھ بغلگیر ہوتے ہیں۔

ڈیمانسٹریشن

تمہید

مہاشے گورو پرشاد نہایت رنگین مزاج شخص ہیں۔ گانے بجانے کے رسیا ہیں۔ سیر و سیاحت سے دلچسپی ہے۔ کھانے کھلانے میں نہایت سیر چشم ہیں یوں تو کسی کے محتاج نہیں بشریف آدمیوں کی طرح رہتے ہیں۔ اور ہیں بھی بھلے آدمی۔ لیکن کسی کام میں چمٹ نہیں سکتے۔ گرٹ ہو کر بھی ان میں لیس نہیں ہے۔ وہ کوئی ایسا کام کرنا چاہتے ہیں۔ جس میں جھٹ پٹ قارون کا خزانہ مل جائے۔ اور وہ ہمیشہ کے لئے بے فکر ہو جائیں۔ بینک سے ششماہی سود چلا آئے۔ کھائیں اور مزے سے پڑے رہیں۔ ایک دن بات بات میں کسی ستم ظریف نے مشورہ دیا، کہ کوئی ناٹک کمپنی کھولو۔ بات معقول تھی۔ سمجھ میں آ گئی۔ دوستوں کو لکھا۔ میں بہت جلد ایک

ڈرامیٹک کمپنی کھولنے جا رہا ہوں - آپ لوگ ڈرامے لکھنا شروع کیجئے - کمپنی کے قواعد و ضوابط مرتب ہوئے - کئی مہینے خوب گرم بازاری رہی کتنے ہی بڑے بڑے آدمیوں نے حصے خریدنے کے وعدے کئے - لیکن نہ حصے بکے - نہ کمپنی کھڑی ہوئی - ہاں اسی دُھن میں گورو پرشاد نے ایک ناٹک ضرور تصنیف کر ڈالا - اور یہ فکر ہوئی، کہ اسے کسی کمپنی کو دیا جائے - لیکن یہ تو معلوم ہی نہ تھا، کہ کمپنی والے ایک ہی گھاگھ ہوتے ہیں - پھر جس کمپنی میں کسی غیر شخص کا داخلہ ہو - وہ تو اس تصنیف میں طرح طرح کے عیب نکالے گا - اور کمپنی کے مالک کو بھڑکا دے گا - بالآخر یہ ترکیب سوچی گئی، کہ احباب کمپنی کے مالکوں پر کچھ ایسا رعب غالب کریں، کہ کمپنی کے ڈرامالسٹ کی دال ہی نہ گل سکے - چنانچہ پانچ آدمیوں کی ایک کمیٹی بنائی گئی - اس میں تمام پروگرام پر تبادلۂ خیالات ہوا - اور دوسرے دن گورو پرشاد جی معہ اپنے رفقاء کے ناٹک دکھانے چلے - ٹانگے آ گئے - ہارمونیم طبلہ وغیرہ سب ان پر لاد دئے گئے - کیونکہ ناٹک کے ڈیمانسٹریشن DEMONSTRATION کا فیصلہ ہوا تھا -

یکایک ونود بہاری نے کہا "یار ٹانگے پر جانے میں کچھ بے رعبی سی ہو گی - مالک خیال کرے گا - یہ بھاشے تو یوں ہی ہیں - اس وقت دس پانچ روپیہ کا منہ نہ دیکھنا چاہئے - میں تو مغربی اشتہار بازی کا قائل ہوں، کہ روپے میں پندرہ آنے اسی میں لگا کر صرف ایک آنہ میں تجارت کرتے ہیں کہیں سے دو موٹریں منگانی چاہئیں "

رسک لال نے کہا "لیکن کرایہ کی موٹروں سے یہ بات پیدا نہ ہو گی - جو آپ چاہتے ہیں - کسی رئیس سے دو موٹریں مانگ لینی چاہئیں -

مارلین ہوں، یا نئے فیشن کی آسٹن؟"

بات یہی تھی۔ بھیس سے بھیک ملتی ہے۔ قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ کس رئیس سے درخواست کی جائے۔ اجی وہ مہا کھوسٹ ہے۔ صبح صبح اس کا نام لے لو، تو دن بھر پانی نہ ملے۔ اچھا سیٹھ جی کے پاس چلیں۔ تو کیسے؟ منہ دھو رکھئے۔ اس کی موٹریں افسروں کے لئے ریزرو ہیں۔ اپنے لڑکے تک کو کبھی بیٹھنے نہیں دیتا۔ آپ کو دے دیتا ہے۔ تو چلو کپور صاحب کے پاس چلیں۔ ابھی انہوں نے نئی موٹر لی ہے۔ اجی اس کا نام مت لو۔ کوئی نہ کوئی بہانہ کرے گا۔ ڈرائیور نہیں ہے۔ زیر مرمت ہے۔ اس قسم کی باتیں بناتے کیا اسے دیر لگتی ہے؟"

گورو پرشاد نے مایوس ہو کر کہا۔ "تم لوگوں نے خواہ مخواہ بکھیڑا کر دیا۔ ٹانگوں پر چلنے سے کیا ہرج تھا؟"

ونود بہاری نے کہا۔ "آپ تو گھاس کھا گئے ہیں۔ ناٹک لکھ لینا دوسری بات ہے۔ اور معاملہ کرنا دوسری بات۔ میری بات سنئے۔ فی صفحہ ایک روپیہ سنا دے گا۔ اپنا سا منہ لے کر رہ جائیے گا۔"

امرناتھ نے کہا۔ "میں سمجھتا ہوں۔ موٹر کے لئے کسی راجہ رئیس کی خوشامد کرنا بے کار ہے۔ تعریف تو جب ہے کہ پیدل چلیں۔ اور وہاں ایسا رنگ جمائیں۔ کہ موٹر سے زیادہ شان جم جائے۔"

ونود بہاری اچھل پڑے۔ سب لوگ پیدل چلے۔ وہاں پہنچ کر کس طرح باتیں شروع ہوں۔ کس طرح تعریفوں کے پل باندھے جائیں۔ کس طرح ڈرامانسٹ صاحب کو خوش کیا جائے۔ تمام راستہ اسی پر گفتگو اور بحث کا بازار گرم رہا۔

آخر یہ لوگ کمپنی کے کیمپ میں پہنچے۔ تقریباً دو بجے کا وقت تھا۔ پروپرائٹر صاحب معہ اپنے ایکٹر اور ڈراماسٹ کے پہلے ہی انتظار میں تھے۔ پان، الائچی، سگریٹ وغیرہ پہلے ہی منگوا لئے گئے تھے۔

اوپر جاتے ہی رسک لال نے مالک سے کہا "معاف فرمایئے گا۔ ہم لوگوں کو یہاں پہنچنے میں کسی قدر دیر ہوئی۔ موٹر سے نہیں، بلکہ پا پیادہ آئے ہیں۔ سب لوگوں کی یہی صلاح ہوئی، کہ آج قدرتی مناظر کا لطف اُٹھاتے ہوئے چلیں۔ گورو پرشاد جی تو قدرت کے پرستاروں میں سے ہیں۔ اگر ان کا بس چلتا ہو، تو آج چمٹا لئے ہوتے، یا تو کہیں بھیک مانگتے ہوتے۔ یا کسی پہاڑ کی کھوہ، یا گاؤں میں کسی برگد کے سایہ میں بیٹھے خوش نوا پرندوں کے وجدانگیز نغموں سے محظوظ ہوتے۔"

ونود نے کہا۔ "اور آئے بھی تو سیدھے راستہ سے نہیں۔ نہ معلوم کہاں کہاں کا چکر کاٹتے خاک چھانتے یہاں تک پہنچے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پاؤں میں سنیچر ہے۔"

امر نے کچھ اور ہی رنگ جمایا۔ پورے ست جگی آدمی ہیں۔ نوکر چاکر تو موٹروں پر سیر کرتے ہیں۔ اور آپ گی گی مارے پھرتے ہیں۔ جب اور رئیس خواب راحت کا لطف اُٹھاتے رہتے ہیں۔ تو آپ ندی کے کنارے افق کی جلوہ نمائیوں میں محو رہتے ہیں۔"

مست رام نے فرمایا۔ "شاعر ہونے کے معنی دین دنیا سے بیگانہ ہو جانا ہے۔ گلاب کی ایک پنکھڑی لے کر اس میں نہ معلوم گھنٹوں کیا دیکھا کرتے ہیں۔ قدرت کے مشاہدے نے ہی یورپ کے بڑے بڑے شعرا کو آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ کاش یہ یورپ میں ہوتے۔ تو ان کے دروازے پر

ہاتھی جھومتا ہوتا - ایک دن ایک لڑکے کو روتے دیکھ کر آپ بھی رونے لگے۔ ہر چند پوچھتا ہوں - بھئی کیوں روتے ہو؟ مگر جواب نہیں دیتے - بلکہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے - منہ سے آواز نہیں نکلتی تھی - بڑی مشکل سے آواز نکلی:"

ونود:- "جناب شاعر کا دل نازک اور لطیف جذبات کا سرچشمہ ہے نغمۂ لطیف کی کان ہے - وسعت کا آئینہ ہے۔"

"واہ واہ! آپ نے کیا بات کہی - وسعت کا آئینہ - واہ! شاعر کی صحبت میں رہ کر آپ پر بھی شاعری کا رنگ غالب آتا جاتا ہے۔"

گوردپرشاد نے عاجزانہ انداز سے کہا۔ "میں شاعر نہیں - اور نہ مجھے شاعری کا دعوٰے ہے - آپ لوگ مجھے زبردستی شاعر بنائے دیتے ہیں - شاعر قدرت کی وہ عجیب و غریب تخلیق ہے - جو عناصرِ خمسہ کی جگہ ذروں سے ترکیب پاتی ہے:"

مست رام:- آپ کی یہی ایک بات ایسی ہے - جس پر سیکڑوں نظمیں نثار ہیں - رشک لال جی شاعر کی عظمت ذہن نشین ہوئی، یا نہیں؛ یاد کر لیجیے - رٹ لیجئے:"

رشک لال:- کہاں تک یاد کروں؟ یہ تو تشبیہات اور استعارات میں گفتگو کرتے ہیں - اور انکسار کا یہ حال ہے، کہ اپنے آپ کو کچھ سمجھتے ہی نہیں - قابلیت و ذہانت کی یہی علامت ہے - جس نے اپنے آپ کو سمجھا، بس وہ رہ گیا - (کمپنی کے مالک سے) آپ تو سب کچھ خود ہی سن لیں گے - اس ڈرامہ میں اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے۔ شاعروں میں جو عام طور پر ایک خود نمائی ہوتی ہے - اس کی

آپ میں کہیں بو بھی نہیں۔ اس ڈرامے کا مواد فراہم کرنے میں آپ نے کچھ نہیں، تو کم از کم ایک ہزار بڑے بڑے پوتھوں کا مطالعہ کیا ہوگا۔ واجد علی شاہ کو خود غرض وقائع نگاروں نے کتنا بدنام کیا ہے۔ آپ سے پوشیدہ نہیں، اس طومار میں سے حقیقت کا انتخاب کرنا انہی کا کام ہے۔

ونود: اسی لئے ہم اور آپ دونوں کلکتے گئے۔ اور وہاں متواتر چھ ماہ تک مٹیا برج کی خاک چھانتے رہے۔ واجد علی شاہ کا قلمی مسودہ تلاش کیا۔ اس ڈراما کی تکمیل کے لئے اس کتاب کی بہت بڑی ضرورت تھی۔ اس میں انہوں نے خود ہی اپنی زندگی کے حالات لکھے ہیں۔ ایک بڑھیا کو بہت کچھ نذر کرنے پر چھ مہینے میں جا کر کتاب ملی۔"

امرناتھ: "کتاب نہیں۔ جواہرات کی کان ہے۔"

مست رام: "اس وقت تو اس کی حالت کوئلے کی سی تھی۔ گورو پرشاد جی نے اس پر مہر لگا کر اشرفی بنا دیا۔ ڈراما ایسا ہونا چاہیئے۔ کہ جو سُنے۔ دل ہاتھوں سے تھام لے۔ ایک ایک نکتہ دل میں تیر و نشتر کی طرح اُتر جائے۔"

امرناتھ: "لٹریچر کے تمام ناٹکوں کو آپ نے چاٹ ڈالا۔ اور فنِ ڈراما پر سیکڑوں کتابیں پڑھ ڈالیں۔"

ونود: "جب ہی تو چیز بھی لاثانی ہوئی ہے۔"

امرناتھ: "لاہور ڈرامیٹک کلب کا مالک ہفتہ بھر یہاں پڑا رہا۔ پیروں پڑا، کہ یہ ناٹک مجھے دے دیجئے۔ لیکن آپ نے نہ دیا، نہ دیا۔ جب ایکٹر ہی اچھے نہیں، تو ان سے اپنا ڈرامہ کھلوانا اس کی مٹی خراب

کرنا تھا۔ اس کمپنی کے ایکٹر ماشاءاللہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اور اس کے ڈرامہ نویس کی سارے زمانہ میں دھوم ہے۔ آپ لوگوں کے ہاتھوں میں پڑکر یہ ڈراما دھوم مچا دے گا۔"

ونود۔" ایک تو مصنف صاحب بذاتِ خود شیطان سے زیادہ مشہور ہیں۔ اس پر ایکٹروں کا اسلوب بیان، ساز و سامان' یہ تمام باتیں مل کر قیامت برپا کر دیں گی۔"

مست رام۔" روز ہی تو کسی کمپنی کا آدمی سر پر سوار رہتا ہے۔ مگر بابو صاحب کسی سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتے۔"

ونود۔" بس ایک یہ کمپنی ہے۔ جس کے تماشا کے لئے دل بے قرار رہتا ہے۔ نہیں تو جتنے اور ڈرامے کھیلے جاتے ہیں۔ دو کوڑی کے ہوتے ہیں۔ میں نے تو تماشا دیکھنا ہی چھوڑ دیا۔"

گورو پرشاد۔" ناٹک لکھنا بچوں کا کھیل نہیں۔ خون جگر پینا پڑتا ہے۔ میرے خیال میں ایک ناٹک لکھنے کے لئے پانچ سال کا وقت بھی کافی نہیں۔ بلکہ اچھا ڈرامہ زندگی میں ایک ہی لکھا جاتا ہے۔ یوں قلم گھسانا دوسری بات ہے۔ بڑے بڑے زبردست مبصروں کا یہی فیصلہ ہے، کہ ڈرامہ زندگی میں صرف ایک ہی لکھا جا سکتا ہے۔ روس، فرانس، جرمنی' تمام زبانوں کے ڈرامے پڑھے۔ مگر کوئی نہ کوئی نقص ہر ایک میں موجود ہے کسی میں جذبات ہیں' تو زبان نہیں۔ زبان ہے' تو جذبات نہیں۔ مذاق ہے تو گانا نہیں۔ گانا ہے تو مذاق نہیں۔ جب تک جذبات' زبان' مذاق اور گانا یہ چاروں باتیں پورے طور پر موجود نہ ہوں۔ اسے ڈرامہ کہنا ہی غلطی ہے۔ میں تو نہایت ہی ناقابل شخص ہوں۔ آپ لوگوں کی صحبت میں کچھ شُدبُد کر لیتا

ہوں۔ میری تصنیف کی حقیقت ہی کیا۔ لیکن اگر پرماتما نے چاہا، تو اس ڈراما میں ایسے نقائص آپ کو نہ ملیں گے۔"

ونود۔"جب آپ کی قابلیت کا یہ حال ہے، تو نقائص رہ کیسے سکتے ہیں۔"

رسک لال۔"دس سال تک آپ نے صرف نغمہ کی ہی مشق کی ہے۔ ہزاروں روپے استادوں کی نذر کر دئے۔ اگر اتنے پر بھی نقص رہ جائے، تو بدقسمتی!"

ریہرسل

ری ہرسل شروع ہوئی۔ اور 'واہ وا' اور 'ہائے ہائے' کا تار بندھا۔ کورس سنتے ہی ایکٹر، پروپرائٹر، اور ناٹک نویس جیسے کسی خواب گراں سے بیدار ہو اُٹھے۔ تمہید نے انہیں زیادہ متاثر نہیں کیا۔ لیکن اصلی چیز سامنے آتے ہی آنکھیں کُھلیں۔ سماں بندھ گیا۔ پہلا سین آیا۔ آنکھوں کے سامنے واجد علی شاہ کے دربار کی تصویر کھنچ گئی۔ درباریوں کی حاضر جوابی اور پھڑکتے ہوئے لطیفے! واہ وا کیا کہنا۔ کیا طرزِ ادا تھی۔ اور کیا شوکتِ الفاظ، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تمام رس ایک ہی جگہ پر مجتمع ہو کر اپنی کیفیت دکھا رہے ہیں۔ تیسرا نظارہ مذاقیہ! ہنستے ہنستے لوگوں کی پسلیاں دکھنے لگیں۔ چوتھا سین نہایت رنجدہ، اور تڑپا دینے والا تھا۔ مذاق کے بعد افسردگی، آندھی کے بعد آنے والا سکون تھا۔ ونود آنکھوں پر ہاتھ رکھے سر جھکائے رو رہے تھے۔ مست رام بار بار ٹھنڈی آہیں کھینچ رہے تھے۔ اور امرناتھ پیہم سسکیاں

بھر رہے تھے۔ اسی طرح سین پر سین اور باب پر باب ختم ہوتے گئے۔ یہاں تک، کہ جب یہ ہیرسل ختم ہوا۔ تو چراغ روشن ہو چکے تھے۔

سیٹھ جی اب تک سونٹھ بنے بیٹھے رہے۔ ڈرامہ ختم ہو گیا۔ لیکن ان کی زبان پر ان کی مبارک رائے کے عکس کا شائبہ تک نہ تھا۔ جڑ بھرت کی طرح بیٹھے تھے۔ نہ مسکراہٹ تھی نہ داد۔ نہ اشک نہ کچھ۔

آخر ونود بہاری نے معاملے کی بات پوچھی، کہ "اس ڈراما کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟"

سیٹھ جی نے اسی بے نیازانہ انداز میں جواب دیا۔ "اس کے متعلق کل عرض کروں گا۔ کل یہیں کھانا بھی کھلیئے گا۔ آپ لوگوں کے لائق کھانا تو کیا ہو سکے گا سلئے صرف بدر کا ساگ سمجھ کر قبول فرمایئے۔"

جیسے ہی پانچوں باہر نکلے۔ مارے خوشی کے سب کی باچھیں کھلی جاتی تھیں۔

ونود نے کہا۔ "پانچ ہزار کی تھیلی ہے۔ ناک ناک بد سکتا ہوں۔"

امر ناتھ: "پانچ ہزار رہے کہ دس۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا۔ لیکن رنگ خوب جما۔"

رسک لال: "میرا اندازہ تو چار ہزار تک ہے۔"

مست رام: "میرا تو یقین یہ ہے کہ دس ہزار سے کم کہے گا ہی نہیں میں تو سیٹھ کے چہرے کی طرف یکسوئی سے دیکھ رہا تھا۔ آج ہی کہہ دیتا۔ لیکن مست خوب ہو رہا تھا۔"

گورو پرشاد۔ "میں نے پڑھا بھی، تو جی توڑ کر۔"

ونود: "ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے آپ کے گلے میں سرسوتی بیٹھ گئی ہو۔ سب کی آنکھیں کھل گئیں۔"

رسک لال :- "مجھے اس کی خاموشی سے ذرا اشتباہ ہوتا ہے"

امر :- "ڈرامہ نسٹ بھی خوب خوش ہو رہا تھا۔ دس بارہ ہزار کا وارا نیارا ہے۔ بھئی آج اسی خوشی میں دعوت ہونی چاہئے"

گورو پرشاد :- "ارے تو کچھ بٹا بھی تو جلسے"

مست :- "جی نہیں، تب تو جلسہ ہوگا۔ آج دعوت ہوگی"

ونود :- "ہو تم خوش قسمت"

رسک لال :- "میری رائے میں تو اس ڈرامہ نسٹ کو گانٹھ لیا جائے اس کی خاموشی مجھے خوف زدہ کر رہی ہے"

مست :- "آپ کو تو خفقان ہو گیا ہے۔ وہ ناک رگڑ کر رہ جائے۔ تب بھی یہ سودا ہو کر ہی رہے گا۔ سیٹھ جی اب بچ کر نکل نہیں سکتے"

ونود :- "ہم لوگوں کی تمہید بھی ذمہ وار تھی"

امر :- "اسی نے تو رنگ جما دیا۔ اب کوئی چھوٹی رقم کہنے کا اُسے حوصلہ ہی نہ ہوگا"

تماشا

رات کو گورو پرشاد کے گھر دوستوں کی دعوت ہوئی۔ دوسرے دن چھ بجے پانچوں آدمی سیٹھ جی کے پاس جا پہنچے۔ شام کا وقت ہوا خوری کا تھا۔ آج موٹر پر نہ آسکنے کے لئے بنا بنایا بہانہ تھا۔ سیٹھ جی آج بے حد خوش نظر آتے تھے۔ کل کی وہ محرّمی صورت غائب ہو گئی تھی۔ بات بات پر چہکتے تھے۔ ہنستے تھے۔ فقرے کستے تھے۔ جیسے لکھنؤ کا کوئی رئیس ہو۔ دعوت کا سامان تیار تھا۔ میز پر کھانا چنا جانے لگا۔ انگور، سنگترے،

کیلے، خشک میوے، مختلف قسم کی مٹھائیاں، کئی طرح کے مربے، شراب وغیرہ سجائے گئے۔ اور یاروں نے خوب مزے سے دعوت کھائی۔ سیٹھ جی مہمان نوازی کے پتلے بنے ہوئے ہر ایک مہمان کے پاس آ آ کر پوچھتے۔ "کچھ اور منگواؤں؟ کچھ تو اور لیجئے۔ آپ لوگوں کے لائق کھانا یہاں کہاں بن سکتا ہے؟"

کھانے کے بعد لوگ بیٹھے۔ تو معاملہ کی بات چیت ہونے لگی۔ گورو پرشاد کا دل امید و بیم سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔

سیٹھ جی:۔ "حضور نے نہایت پایہ ڈراما لکھا ہے۔ کیا بات ہے۔"

ڈراماسٹ:۔ "یہاں کی پبلک اچھے ڈرامہ کی قدر نہیں کرتی۔ ورنہ ڈرامہ لاجواب ہوتا۔"

سیٹھ جی:۔ "پبلک قدر نہیں کرتی۔ نہ کرے۔ ہمیں اس کی بالکل پروا نہیں۔ رتی بھر پروا نہیں۔ میں تو اس کی تیاری میں صرف پچاس ہزار بابو صاحب کی خاطر جمع کر دوں گا۔ آپ نے جب اتنی محنت سے ایک چیز لکھی ہے۔ تو میں اس کی اشاعت بھی اسی حوصلہ سے کر دوں گا۔ ہمارے لئے کیا یہ کم خوش قسمتی ہے، کہ آپ جیسے معزز اصحاب اس میدان میں اُتر آئے۔ یہ تماشا حضور کو زندہ جاوید بنا دے گا۔"

ڈراماسٹ:۔ "ایسا ڈرامہ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ لکھتا میں بھی ہوں۔ اور لوگ بھی لکھتے ہیں۔ لیکن آپ کی پرواز تک کس کی رسائی ہو سکتی ہے۔ کہیں تو آپ نے شکسپیر کو بھی مات کر دیا ہے۔"

سیٹھ جی:۔ "ہاں جناب، جو چیز دل کی اُمنگ سے لکھی جاتی ہے وہ ایسی ہی اچھوتی اور لاجواب ہوتی ہے۔ شکسپیر نے جو کچھ لکھا، وہ

روپیہ کے لالچ سے لکھا۔ ہمارے دوسرے ڈرامہ نویس بھی دولت کے لئے ہی لکھتے ہیں۔ ان میں وہ بات کہاں پیدا ہو سکتی ہے۔ جو بے غرضانہ لکھنے والوں میں پیدا ہو سکتی ہے۔ گوسائیں جی کی رامائن کیوں زندہ ہے؟ اس لئے، کہ وہ بھگتی اور پریم سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ سعدی کی گلستاں، بوستاں۔ ہومر کی تصنیفات اس لئے مقبول عام ہیں، کہ ان لوگوں نے دل کی امنگ سے لکھا ہے۔ جو امنگ ہے وہ ایک ایک لفظ، ایک ایک جملہ اور ایک ایک ترکیب پر پہیوں کا دشس کرتا ہے۔ مگر بندۂ دولت کو تو ایک کام ختم کر کے دوسرے کو شروع کرنے کا فکر ہوتا ہے۔"

ڈرامائسٹ:۔ "آپ بجا فرماتے ہیں۔ ہمارے ادب کی تنزلی کا باعث بھی یہی ہے۔ کہ ہم دولت کی غرض یا ناموری کے لئے لکھتے ہیں۔"

سیٹھ جی:۔ "سوچئے۔ آپ نے دس ہزار صرف فن موسیقی کی تحصیل میں خرچ کر ڈالے۔ لاکھوں روپے گویوں اور اہل ہنر کی نذر کئے۔ کہاں کہاں سے اور کتنی جدوجہد سے اس ناٹک کا مصالحہ جمع کیا۔ نہ جانے کتنے والیانِ ریاست کو سنایا۔ اس جدوجہد اور جاں فشانی کی قیمت کون ادا کر سکتا ہے؟"

ڈرامائسٹ:۔ "ممکن ہی نہیں۔ ایسی تصنیف کے معاوضہ کا تصوّر کرنا ہی ان کی توہین ہے۔ ان کا معاوضہ اگر کچھ ہے، تو وہ اپنی روح کی تشفی ہے۔ اور وہ قناعت جو آپ کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہو رہی ہے۔"

سیٹھ جی:۔ "آپ نے سچ کہا۔ ایسی تصنیف کا معاوضہ تسکین روح ہے۔ معاوضہ تو ایسی تصانیف کا بھی مل جاتا ہے۔ جو صحافت پر بدنما داغ

ہیں - آپ ڈرامہ لے لیجئے - اور آج ہی پارٹ بھی تقسیم کر دیجئے۔ تین مہینے کے اندر اسے کھیل ڈالنا ہو گا۔"

میز پر مسودہ پڑا ہوا تھا - ڈرامہ ٹسٹ نے اسے اٹھا لیا - گورو پرشاد نے نیم باز نگاہوں سے ونود کی طرف دیکھا - ونود نے امر کی جانب، امر نے رسک کی طرف، لیکن لفظ کسی کے منہ سے نہ نکلا - جیسے سیٹھ جی نے سب کے منہ سی دئے ہوں - ڈراماٹسٹ صاحب کتاب لے کر چل دئے -

سیٹھ جی نے مسکرا کر کہا "حضور کو تھوڑی سی تکلیف اور کرنی ہو گی - ڈراما کا ریہرسل شروع ہونے پر آپ کو تھوڑے دنوں کمپنی کے ساتھ رہنے کی تکلیف گوارا کرنی پڑیگی - ہمارے ایکٹر بیشتر گجراتی ہیں - یہ ہندی زبان کے تلفظ کو اچھی طرح ادا نہیں کر سکتے - کہیں کہیں الفاظ پر بلا ضرورت زور دے دیتے ہیں - آپ کی نگرانی سے یہ تمام خامیاں دور ہو جائیں گی - اگر ایکٹروں نے پارٹ اچھا ادا نہ کیا، تو آپ کی تمام محنت پر پانی پھر جائے گا۔"

یہ کہتے کہتے اس نے لڑکے کو آواز دی - "بوائے آپ لوگوں کے لئے سگار لاؤ۔"

سگار آ گئے - سیٹھ جی اٹھ کھڑے ہوئے - یہ دوستوں کی انجمن کو رخصت ہو جانے کا اشارہ تھا - پانچوں دوست بھی اٹھے - سیٹھ جی دروازے تک آئے - پھر سب سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا -

"آج اس غریب کمپنی کا تماشا دیکھ لیجئے - پھر خدا جانے کب اتفاق ہو۔"

گورو پرشاد نے جیسے کسی قبر کے نیچے سے کہا ہو - "ہو سکا، تو آجاؤں گا۔"

سڑک پر آ کر پانچوں دوست ایک دوسرے کا منہ تاکنے لگے - تب

پانچوں زور سے قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

ولونڈے نے کہا۔"یہ ہم سب کا ہی گورو گھنٹال نکلا۔"

امر۔"آنکھوں میں صاف دھول جھونک دی۔"

رسک۔" میں اس کی خاموشی دیکھ کر پہلے ہی سے ڈر رہا تھا، کہ یہ کوئی اول درجہ کا گھاگھ ہے۔"

مست مان گیا۔ اس کی کھوپڑی کو یہ چپت عمر بھر نہ بھولے گی۔

گورو پرشاد ان چہ میگوئیوں میں شامل نہ ہو سکے۔ وہ اس طرح سر جھکائے چلے جا رہے تھے۔ گویا وہ ان کے خیالات کی تہ تک ہی نہیں پہنچ سکے۔

برات

آج بابو دیو کی ناتھ اپنی پندرہ سال کی بیاہتا بیوی کو چھوڑ کر نئی شادی کرنے جارہے ہیں۔ عزیز و اقربا جمع ہیں۔ مگر کوئی یہ پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا، کہ آخر اس بے کس پر اتنا عتاب کیوں ہے؟ بابو دیو کی ناتھ سے کیوں بُرے بنیں۔ دروازہ پر نوبت جھڑ رہی ہے۔ اندر مستورات بیاہ کے گیت گارہی ہیں۔ نوکر چاکر خوش رنگ وردیاں پہنے اِدھر اُدھر دوڑ رہے ہیں۔ براتی اصحاب اپنی اپنی آرائش میں مصروف ہیں۔ مگر اس شادی کے ساتھ ایک عزیز جان کا خون ہو رہا ہے۔ اس کی کسی کو پروا نہیں۔

آج پندرہ سال ہوئے۔ جب دیو کی ناتھ کی شادی پھول وتی سے ہوئی تھی۔ پھول وتی حسین تھی۔ باتمیز تھی۔ شیریں دہن تھی۔ تعلیم یافتہ تھی۔

دیو کی ناتھ بھی نیک اطوار، مستقل مزاج، روشن خیال، مگر پہلے ہی دن دُلہا دُلہن میں کچھ ایسی بدمزگی پیدا ہوئی، کہ دونوں میں ایک خلیج حائل ہو گئی۔ اور زمانہ کے ساتھ ساتھ وہ خلیج وسیع ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ آج دیو کی ناتھ نئی شادی کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

اور اس بدمزگی کا باعث کیا تھا؛ معاشرتی معاملات میں اختلاف۔ دیو کی ناتھ پرانی تہذیب کے قائل تھے۔ پھول وتی نئی روشنی کی دلدادہ۔ پرانی تہذیب پردہ چاہتی ہے۔ تحمّل اور صبر چاہتی ہے۔ نئی روشنی آزادی چاہتی ہے۔ اعزاز چاہتی ہے۔ حکومت چاہتی ہے۔ دیو کی ناتھ چاہتے ہیں پھول وتی میری ماں کی خدمت کرے۔ بغیر اجازت گھر سے قدم نہ نکالے۔ لمبا سا گھونگھٹ نکال کر چلے۔ پھول وتی کو ان باتوں میں سے ایک بھی پسند نہ تھی۔ دونوں میں مباحثے ہوئے۔ سخت کلامیوں کی نوبت آئی۔ شکر رنجی ہوئی۔ میاں نے بیوی کے میکے والوں کی تحقیر کی۔ بیوی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ میاں نے ڈانٹ بتائی۔ بیوی نے میکہ کی راہ لی۔ میکہ بھی دور نہ تھا۔ دس منٹ میں گھر جا پہنچی۔ مہینوں تک دونوں کھنچے رہے۔ پھر پھول وتی منائی گئی۔ سسرال آئی۔ مگر دو ہی چار دن میں وہی قضیئے شروع ہو گئے۔ نہ دیو کی ناتھ اپنے عمل کی اصلاح کر سکتے تھے، نہ پھول وتی اپنے طرز عمل کی۔ اب کے برسوں بول چال بند رہی۔ آخر احباب کے سمجھانے سے دیو کی ناتھ تیسری بار بیوی کو منا لائے۔ مگر اب کے معاملات نے کچھ ایسا طول کھینچا، کہ دائمی مفارقت ہو گئی۔ نہ انہوں نے بلایا، نہ وہ آئی۔ اور آج میاں شوہر نئی شادی رچا کر اپنے دل کی آگ بجھا رہے ہیں۔ کیا پھول وتی کے لئے بھی یہی آزادی

ہے؟ کیا اسے یہ آزادی ہوتی، تو دیو کی ناتھ کو نئی شادی ٹھاننے کا حوصلہ ہوتا؟

دیو کی ناتھ کی ماں صندوق میں زیوروں کو سجا رہی ہیں۔ نئی بہو کی خوشی میں متوالی ہو رہی ہیں۔ اس پر سُن لیا ہے، کہ بہو ہوشیار ہے۔ خدمت گذار ہے۔ شرمیلی ہے پھر کیا پوچھنا، اس لکشمی کے آتے ہی گھر کی رونق ہی کچھ اور ہو جائے گی۔ پڑوسنیں اسے چڑانے کو کہتی ہیں۔ "نئی بہو جی پڑھی لکھی تو خوب ہوں گی"

ساس جی منہ بنا کر کہتی ہیں۔ "مجھے میم صاحب کی ضرورت نہیں۔ میں درگذری ایسی پڑھی لکھی سے مجھے اب گنوار بہو چاہیئے۔"

دروازہ سے منشی جی آ کر بولے "بھئی جلدی کرو۔ گاڑی چھوٹ جائیگی پھر کوئی دوسری ساعت نہیں ہے۔"

ساس کہتی ہے "آپ اپنا کام دیکھئے۔ مجھے کوئی دیر نہیں ہے۔ درزی کو بلوا دیجئے۔ نوشہ کو کپڑے پہنا دے۔"

درزی نے آ کر جوڑا پہنایا۔ مالی نے آکر سہرا باندھا۔ چمار نے آ کر جوتی پہنائی۔ پھوپھا جی پگڑی سنوار گئے۔ بوآ جی نے آ کر آنکھوں میں کاجل لگایا۔ مامی جی نے آ کر بندن وار باندھ دی۔ دُلہا آدمی سے بندر بن گیا۔ ۴۵ سال کی عمر۔ کچھ کچھ بالوں میں سفیدی آ چلی تھی۔ دو چار دانت بھی جواب دے چکے تھے۔ چہرہ پر جھریاں پڑی ہوئی مگر وضع ایسی، گویا ابھی عنوانِ شباب ہے۔

۲

ادھر پھول وتی کے باپ کو خبر ملی۔ دریائے تفکر میں ڈوب گئے۔ پہلے

سے خبر ہوتی، تو ہاتھ پاؤں مارتے - مگر اب تو برات جانے کو تیار ہے - اس تنگ وقت میں وہ کیا کر سکتے ہیں؟ سوچ رہے تھے - ہم لوگوں سے تو نیچی ذاتیں ہی اچھی ہیں - ان کو کم سے کم برادری کا تو خوف ہے - ہم لوگوں نے تو بے غیرتی پر کمر باندھ لی ہے - ہائے 'پھول وتی کو معلوم ہوگا - تو اس کی کیا حالت ہوگی - آج پندرہ سال گذر گئے - اسے کیا آرام ملا؟ بیواؤں کی زندگی بسر کر رہی ہے - اس پر یہ نیا صدمہ! یہ نئی چوٹ اس سے کیونکر برداشت ہوگی؟

پھول وتی اُن آن پر جان دینے والی عورتوں میں سے تھی - جو دل میں ایک بات ٹھان کر پھر پیچھے ہٹنا نہیں جانتیں - اگر وہ ذرا سا بھی دب سکتی تو اس کی زندگی آرام سے کٹ جاتی - لیکن پندرہ سال کی بے اعتنائی بھی اس کی خودداری پر فتح نہ پا سکی - اسے جونہی یہ خبر ملی - اس نے دل میں طے کر لیا، کہ یہ شادی میرے جیتے جی نہیں ہوگی - ہرگز نہیں ہوگی! وہ نئی بہو کے ساتھ زندگی کی بہار نہیں اڑا سکتے - اگر میں رو رو کر زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں - تو تم کو بھی یوں ہی جلتے رہنا پڑیگا - تم میری چھاتی پر مونگ نہیں دل سکتے - اس نے گھر میں کسی سے کچھ نہ کہا - والد کو بھی خبر نہ دی - آہستہ سے گھر سے نکلی - ایک ٹانگہ کرایہ پر لیا - اور سسرال چلی - راستہ میں سوچتی جاتی تھی - آج اس زندگی کا آخری فیصلہ کر دوں گی - دکھلا دوں گی، کہ آج بھی ہندوستان میں ایسی عورتیں ہیں، جو اپنی بات کے لئے ہنستے ہنستے جان دے دیتی ہیں - وہ عیش و آرام کے لئے زندہ نہیں رہتیں - بلکہ اپنے دھرم کو پالنے کے لئے - اس کی حالت بالکل دیوانوں کی سی ہو گئی تھی - کبھی آپ ہی آپ ہنستی -

کبھی آپ ہی آپ روتی - نہ جانے کیا بکتی جاتی تھی - اسی بے ہوشی کے عالم میں شوہر کے مکان سے بہت دور نکل گئی - جب ہوش آیا، تو ٹانگے والے سے پوچھا - "یہ کون سا محلہ ہے ؟"

بولا۔ "یہ کٹڑہ ہے"

"واہ! تم یہاں کہاں آ گئے - مجھے تو سبزی منڈی جانا ہے"

"تو آپ نے پہلے کیوں نہ کہا - اسی طرف سے تو آیا ہوں - کیا آپ کو گھر معلوم نہیں ؟"

"مجھے خیال نہ تھا"

"کیا سو گئی تھیں - مجھے اتنا چکر پڑا"

"بک بک مت کرو - ٹانگہ لوٹا لو"

آدھ گھنٹہ میں ٹانگہ دبو کی نانی کے دروازے پر جا پہنچا -

۳

برات تیار تھی - دولھا پھولوں سے سجے ہوئے موٹر پر بیٹھ چکا تھا - باجے بج رہے تھے - یہ تماشا دیکھ کر پھول ونی کے سینہ پر سانپ سا لوٹنے لگا - جی میں آیا - کنوئیں میں کود پڑوں - تا کہ زندگی کا خاتمہ ہو جائے - جب اپنا کوئی پرساں ہی نہیں، تو اس زندگی سے موت کہیں اچھی - پہلے یہ خیال آیا، کہ کیوں نہ میں بھی ان کی چھاتی پر مونگ دلوں - انہیں دکھا کر کسی سے شادی کر لوں - پھر دیکھوں، یہ حضرت کیا کر لیتے ہیں میرا؟ مگر اس خیال کو اس نے دل سے نکال دیا - نہیں، میں عورتوں کے نام کو داغ نہیں لگاؤں گی - اپنے خاندان کو بدنام نہ کروں گی - مگر ان حضرات کو برات لے کر جانے نہ دوں گی - چاہے میری جان ہی کیوں نہ جائے -

موٹر نے ہارن بجایا - اور چلا ہی چاہتی تھی، کہ پھول وتی ٹانگے سے اُتر پڑی - اور آکر موٹر کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

دیو کی ناتھ اسے دیکھتے ہی جل بھُن کر خاک ہو گئے - بولے - "تم یہاں کیوں آئیں؟ تمہیں یہاں کس نے بلایا؟"

پھول وتی نے منہ پھیرتے ہوئے کہا "مجھے نیوتے کی ضرورت نہ تھی۔"

دیو کی ناتھ: "ہٹ جاؤ - میرے سامنے سے - میں تمہاری صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔"

پھول وتی: "تم شادی کرنے نہیں جا سکتے۔"

دیو کی ناتھ: "مجھے تم روک لو گی؟"

پھول وتی: "یا تو روک لوں گی - یا اپنی جان دے دوں گی۔"

دیو کی ناتھ: "اگر جان دینا چاہتی ہو، تو کنوئیں میں کود پڑو - یا زہر کھا لو - اس پر بھی صبر نہ آئے، تو دوسری شادی کر لو - یا کسی کو لے کر نکل جاؤ - میں تمہیں نہیں روکتا - میں قسم کھاتا ہوں، کہ میں زبان تک نہ ہلاؤں گا - میرے پیچھے کیوں پڑتی ہو؟ میں نے تمہارے لئے آدھی زندگی تلخ کر دی - اب مجھ میں ضبط کی طاقت نہیں ہے - میرا کہنا مانو - راستہ سے ہٹ جاؤ - ورنہ میں موٹر چلا دوں گا۔"

پھول وتی: "میں بھی یہی چاہتی ہوں - مجھے پیروں تلے روند کر تم جا سکتے ہو۔"

دیو کی ناتھ: "تم کیا چاہتی ہو - میں ساری زندگی تمہارے نام کو روندتا رہوں - جو عورت اپنے شوہر سے دشمنی کرے - اس کی صورت دیکھنا گناہ ہے۔"

پھول وتی۔ "میں تمہیں اپنی صورت دکھانے نہیں آئی ہوں۔"

دیوکی ناتھ۔ "تو پھر تریاچرتر کیوں کرتی ہو۔ کیوں نہیں کسی طرف اپنا منہ کالا کرلیتی۔ میں ایسی عورتوں کے چرتر خوب جانتا ہوں۔"

پھول وتی نے خون آب آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ "ذرا زبان سنبھال کر باتیں کرو۔ ورنہ میری آہ پڑ جائے گی۔ میں اور سب کچھ برداشت کرسکتی ہوں۔ تحقیر برداشت نہیں کرسکتی۔"

دیوکی ناتھ نے گردن ہلا کر کہا۔ "ایسی ہی تو بڑی عصمت مآب ہو۔"

پھول وتی۔ "جو خود بے وفا ہیں۔ انہیں دوسروں سے وفا کی امید رکھنے کا کوئی حق نہیں۔"

دیوکی ناتھ فوراً موٹر پر سے اُتر آئے۔ بولے۔ "سامنے سے ہٹے گی یا نہیں؟"

پھول وتی نے مستقل انداز سے کہا۔ "نہیں۔"

دیوکی ناتھ دانت پیس کر بولے۔ "ہٹ جا، نہیں تو میں کچل دوں گا۔ اور ساری شیخی دھری رہ جائے گی۔"

پھول وتی۔ "تمہیں اختیار ہے۔ جو چاہو کرو۔ میں نے ایک بار کہہ دیا۔ میں سب کچھ برداشت کرسکتی ہوں۔ تحقیر نہیں برداشت کرسکتی۔"

دیوکی ناتھ۔ "میں پھر سمجھائے دیتا ہوں، کہ ہٹ جا۔ نہیں تو میں کچل دوں گا۔ گدھی کہیں کی۔"

پھول وتی۔ "تو نکال لو دل کا ارمان نا! زبان کیوں خراب کرتے ہو؟ میں دل میں ٹھان کر آئی ہوں، کہ میرے جیتے جی تم چین نہ کرنے پاؤ گے۔"

دیوکی ناتھ "میں نے کہہ تو دیا۔ جاکر کسی سے اپنی شادی کر لے۔ مجھ سے دستبرداری لکھالے۔ میں نہیں چاہتا، کہ تو میرے نام کو روئے۔"

پھول وتی۔ "میری شادی تو اب بھگوان کے گھر ہوگی۔ لیکن جیتے جی یہ ستم برداشت نہیں کرسکتی۔"

دیوکی ناتھ اب ضبط نہ کرسکے۔ ڈرائیور سے بولے۔

"چلا دو موٹر۔ جو کچھ ہوگا۔ دیکھا جائے گا۔ مجھ پر دھونس جمانے چلی ہے۔"

ڈرائیور نے موٹر چلانے سے انکار کیا۔ وہ ایک عورت پر دیدہ و دانستہ موٹر چلاکر اپنی زندگی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ زندہ رہیگا تو بھیک مانگ کھائے گا۔ ایسی نوکری اسے منظور نہیں۔ وہ موٹر سے اُتر کر چل دیا۔

پھول وتی نے تازیانہ جمایا "تم مجھے موت سے کیا دھمکاتے ہو۔ موت سے وہ ڈرے جسے عیش و آرام کی آرزو ہو۔ یہاں تو مرنے کے لئے تیار ہو کر آئی ہوں۔ زندہ رہ کر مجھے کرنا ہی کیا ہے؟ رونے سے جی بھر گیا۔ اب اس کی خواہش نہیں ہے۔"

دیوکی ناتھ کا غصہ طیش کی حد تک جا پہنچا۔ جب انسان کی قوت تمیز سلب ہو جاتی ہے۔ تو وہ اندھا ہو جاتا ہے۔ اتنے آمیوں کے روبرو ایک عورت کے ہاتھوں وہ خفیف نہ ہونا چاہتا تھا۔ سفاکانہ عزم کے ساتھ ہارن بجایا۔

پھول وتی ایک بار چونک پڑی۔ اور فطری حفظ بقا کے زیر اثر ایک قدم ہٹ گئی۔ مگر فوراً سنبھل کر پھر موٹر کے سامنے آئی۔ اور لیٹ گئی

اس کے ترکش کا یہ آخری تیر تھا۔

دوبارہ ہارن بجا۔

پھول وتی نے جنبش نہ کی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا دل بیٹھا جاتا ہے۔

موٹر نے تیسری بار ہارن بجایا۔ اور ایک شانِ فرعونیت کے ساتھ چل پڑا۔ ایک چیخ کی آواز سُن پڑی۔ اور موٹر آگے نکل گیا۔

پھول وتی کا تنِ نازک زمین پر پڑا ہوا ستار کے چوٹ کھائے ہوئے تاروں کی طرح کانپ رہا تھا۔ جس نے کبھی شوہر کا ایک کلمۂ سخت نہیں برداشت کیا، وہ آج کیا یہ تحقیر برداشت کر سکتی تھی؟

۴

نظارہ اتنا دردناک تھا، اتنا نفرت انگیز، اتنا وحشیانہ، کہ ہزاروں تماشائیوں کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اجتماعی ذہنیت ہمیشہ انتہا کی طرف مائل ہوتی ہے۔ وہ سب کچھ کر گذرتی ہے۔ جو افراد کے لئے ناقابلِ خیال ہے۔ سیلاب اگر آبادیوں کو غرقاب کرتا ہے۔ تو زمین کو بھی زرخیز کرتا ہے۔ دریائے تہ نشیں کے سکون میں قوتِ عمل کہاں؟

اس مجمع میں ستم ناروا کے خلاف احتجاج کا ایک سیلاب سا آگیا۔ خونِ بیداد کے لئے مشتعل ہو گیا۔ قانون پر تصرف اس ذہنیت کی خصوصیت ہے۔

صدہا آدمی ایک اندھے جنون کے عالم میں موٹر کی طرف دوڑے دیوکی ناتھ کا ہاتھ پکڑ کر موٹر سے کھینچ لیا۔ اور خونخوار درندوں کی طرح اس پر چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے۔ اور آنِ واحد میں نوشہ اپنی ساری

تمنائیں لئے، ایک تودۂ استخوان بنا خونی سہرا سر پر رکھے، زمین پر ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔

دونوں لاشیں آمنے سامنے پڑی تھیں۔ دونوں پر حسرت برس رہی تھی۔ کون قاتل تھا؟ کون مقتول؟

پھر رات گئے دونوں جنازے چلے۔ ڈھول مجیرے کی جگہ آہ و بکا کی گرم بازاری تھی۔

یہ نئی برات تھی!

نجات

دُکھی چمار دروازے پر جھاڑو لگا رہا تھا۔ اور اس کی بیوی جُھریا گھر کو لیپ رہی تھی۔ دونوں اپنے اپنے کام سے فراغت پا چکے، تو چمارن نے کہا۔

"تو جا کر پنڈت بابا سے کہہ آؤ۔ ایسا نہ ہو کہیں چلے جائیں۔"

دُکھی: "ہاں جاتا ہوں۔ لیکن یہ تو سوچ کہ بیٹھیں گے کس چیز پر؟"

جُھریا: "کہیں سے کوئی کھٹیا نہ مل جائے گی، ٹھکرانی سے مانگ لانا۔"

دُکھی: "تو تو کبھی کبھی ایسی بات کہہ دیتی ہے کہ بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ بھلا ٹھکرانے والے مجھے کھٹیا دیں گے؟ جا کر ایک لوٹا پانی مانگوں، تو نہ ملے۔ بھلا کھٹیا کون دے گا۔ ہمارے اوپلے، ایندھن، بھوسا لکڑی تھوڑے ہی ہیں۔ کہ جو چاہے، اُٹھا لے جائے۔ اپنی کھٹولی دھو کر رکھ دے۔ گرمی کے تو دن ہیں۔ اُن کے آتے آتے سوکھ جائے گی۔"

جھُریا۔ "ہماری کھوٹلی پر وہ نہ بیٹھیں گے، دیکھتے نہیں، کتنے نیم دھرم سے رہتے ہیں۔"

دُکھی نے کسی قدر مغموم لہجہ میں کہا۔ "ہاں، یہ بات تو ہے۔ مہوے کے پتے توڑ کر ایک پتل بنا لوں، تو ٹھیک ہو جائے۔ پتل میں بڑے آدمی کھاتے ہیں۔ وہ پاک ہے۔ لا تو لاٹھی، پتے توڑ لوں۔"

جھُریا۔ "پتل میں بنا لوں گی۔ تم جاؤ۔ لیکن ہاں انہیں سیدھا بھی جائے اور تھالی بھی۔ چھوٹے بابا تھالی اُٹھا کر پٹک دیں گے۔ وہ بہت جلد غصہ میں آجاتے ہیں۔ غصہ میں پنڈتانی تک کو نہیں چھوڑتے۔ لڑکے کو ایسا پیٹا، کہ آج تک ٹوٹا ہاتھ لئے پھرتا ہے۔ پتل میں سیدھا بھی دے دینا، مگر چھونا مت۔ بھوری گونڈ کی لڑکی کو لے کر شاہ کی دکان سے چیزیں لے آنا۔ سیدھا بھرپور، سیر بھر آٹا، آدھ سیر چاول، پاؤ بھر دال، آدھ پاؤ گھی، نمک، ہلدی، اور پتل میں ایک کنارے چار آنہ کے پیسے رکھ دینا۔ گونڈ کی لڑکی نہ ملے، تو بھرجن کے ہاتھ پیر جوڑ کر لے آنا۔ تم کچھ نہ چھونا، ورنہ غضب ہو جائے گا۔"

ان باتوں کی تاکید کر کے دُکھی نے لکڑی اُٹھا لی۔ اور گھاس کا ایک بڑا سا گٹھا لے کر پنڈت جی سے عرض کرنے چلا۔ خالی ہاتھ بابا جی کی خدمت میں کس طرح جاتا۔ نذرانے کے لئے اس کے پاس گھاس کے سوا اور کیا تھا۔ اسے خالی دیکھ کر تو بابا جی دور ہی سے دھتکار دیتے۔

۲

پنڈت گھاسی رام ایشور کے پرم بھگت تھے۔ نیند کھلتے ہی ایشور

اپاسنا میں لگ جاتے ۔ منہ ہاتھ دھوتے دھوتے آٹھ بجتے۔ تب اصلی پوجا شروع ہوتی ۔ جس کا پہلا حصہ بھنگ کی تیاری تھی ۔ اس کے بعد آدھ گھنٹہ تک چندن رگڑتے ۔ پھر آئینے کے سامنے ایک تنکے سے پیشانی پر تلک لگاتے ۔ چندن کے متوازی خطوں کے درمیان لال روئی کا ٹیکہ ہوتا ۔ پھر سینہ پر، دونوں بازوؤں پر چندن کے گول گول دائرے بناتے ۔ اور ٹھاکر جی کی مورتی نکال کر اسے نہلاتے ۔ چندن لگاتے، پھول چڑھاتے ۔ آرتی کرتے ۔ اور گھنٹی بجاتے ۔ دس بجتے بجتے وہ پوجن سے اٹھتے ۔ اور بھنگ چھان کر باہر آتے ۔ اس وقت دو چار ججمان دروازے پر آجاتے ۔ ایشور اپاسنا کا فی الفور پھل مل جاتا ۔ یہی ان کی کھیتی تھی ۔

آج وہ عبادت خانے سے نکلے، تو دیکھا، دُکھی چمار گھاس کا ایک گٹھا لئے بیٹھا ہے ۔ انہیں دیکھتے ہی اُٹھ کھڑا ہوا ۔ اور نہایت ادب سے ڈنڈوت کر کے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا ۔ ایسا پر جلال چہرہ دیکھ کر اس کا دل عقیدت سے پُر ہو گیا ۔ کتنی تقدس مآب صورت تھی ۔ چھوٹا سا گول مول آدمی ۔ چکنا سر، پھولے ہوئے رخسار، روحانی جلال سے منور آنکھیں، اس پر روئی اور چندن نے دیوتاؤں کی تقدیس عطا کر دی تھی ۔ دکھی کو دیکھ کر شیریں لہجہ میں بولے ۔ "آج کیسے چلا آیا رے دُکھیا ؟"

دُکھی نے سر جھکا کر کہا ۔ "بیٹا کی سگائی کر رہا ہوں مہاراج ! ساعت شگن بچارنا ہے ۔ کب مرجی ہو گی ؟"

گھاسی: "آج تو مجھے چھٹی نہیں ہے ۔ شام تک آجاؤں گا ۔"

دُکھی ۔ "نہیں مہاراج ! جلدی مرجی ہو جائے ۔ سب سامان ٹھیک کر آیا ہوں ۔ یہ گھاس کہاں رکھ دوں ؟"

گھاسی۔ "اس گائے کے سامنے ڈال دے۔ اور ذرا جھاڑو لے کر دروازہ تو صاف کر دے۔ یہ بیٹھک بھی کئی دن سے لیپی نہیں گئی۔ اسے بھی گوبر سے لیپ دے۔ تب تک میں بھوجن کر لوں۔ پھر ذرا آرام کر کے چلوں گا۔ ہاں یہ لکڑی بھی چیر دینا۔ کھلیان میں چار کھانچی بھوسہ پڑا ہے۔ اسے بھی اُٹھا لانا، اور بھوسیلے میں رکھ دینا۔"

دُکھی فوراً حکم کی تعمیل کرنے لگا۔ دروازے پر جھاڑو لگائی۔ بیٹھک کو گوبر سے لیپا۔ اس وقت بارہ بج چکے تھے۔ پنڈت جی بھوجن کرنے چلے گئے۔ دکھی نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اسے بھی زور کی بھوک لگی۔ لیکن وہاں کھانے کو دھرا ہی کیا تھا؟ گھر یہاں سے میل بھر تھا۔ وہاں کھانے چلا جائے، تو پنڈت جی بگڑ جائیں سب بے چارے نے بھوک دبائی۔ اور لکڑی پھاڑنے لگا۔ لکڑی کی موٹی سی گرہ تھی۔ جس پر کتنے ہی بھگتوں نے اپنا زور آزمایا تھا۔ وہ اسی دم خم کے ساتھ لوہے سے لوہا لینے کے لئے تیار تھی۔ دُکھی گھاس چھیل کر بازار لے جاتا۔ لکڑی چیرنے کا اسے محاورہ نہ تھا۔ گھاس اس کے کھرپے کے سامنے سر جھکا دیتی تھی۔ یہاں کس کس کر کلہاڑی کا بھرپور ہاتھ جماتا۔ لیکن اس گرہ پر نشان تک نہ پڑتا تھا۔ کلہاڑی اچٹ جاتی۔ پسینہ سے تر تھا۔ ہانپتا تھا۔ تھک کر بیٹھ جاتا تھا۔ پھر اُٹھتا تھا۔ ہاتھ اٹھائے نہ اُٹھتے تھے۔ پاؤں کانپ رہے تھے۔ ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، پھر بھی اپنا کام کئے جاتا تھا۔ اگر ایک چلم تمباکو پینے کو مل جاتا، تو شاید کچھ طاقت آ جاتی۔ اس نے سوچا، یہاں چلم اور تمباکو کہاں ملے گا۔ برہمنوں کا گاؤں ہے۔ برہمن ہم سب نیچ جاتوں کی طرح تمباکو تھوڑا ہی پیتے ہیں۔ یکا یک اُسے یاد آیا کہ گاؤں

میں ایک گونڈ بھی رہتا ہے۔ اس کے یہاں ضرور چلم تمباکو ہوگی۔ فوراً اس کے گھر دوڑا۔ خیر محنت سپھل ہوئی۔ اس نے تمباکو اور چلم دی۔ لیکن آگ وہاں نہ تھی۔ دکھی نے کہا "آگ کی فکر نہ کرو بھائی۔ پنڈت جی کے گھر سے آگ مانگ لوں گا۔ وہاں تو ابھی رسوئی بن رہی تھی۔"

یہ کہتا ہوا وہ دونوں چیزیں لے کر چلا۔ اور پنڈت جی کے گھر میں دالان کے دروازہ پر کھڑا ہو کر بولا۔ "مالک ذرا سی آگ مل جائے تو چلم پی لیں۔"

پنڈت جی بھوجن کر رہے تھے۔ پنڈتانی نے پوچھا "یہ کون آدمی آگ مانگ رہا ہے؟"

"ارے وہی سسرا دکھیا چمار ہے۔ کہا ہے تھوڑی سی لکڑی چیر دے۔ آگ ہے تو دے دو!"

پنڈتانی نے بھنویں چڑھا کر کہا۔ "تمہیں تو جیسے پوتھی پترے کے پھیر میں دھرم کرم کی سدھ بھی نہ رہی۔ چمار ہو، دھوبی ہو، پاسی ہو۔ منہ اٹھائے گھر میں چلے آئے۔ پنڈت کا گھر نہ ہوا، کوئی سرائے ہوئی۔ کہہ دو ڈیوڑھی سے چلا جائے۔ ورنہ اسی آگ سے منہ جھلس دوں گی۔ بڑے آگ مانگنے چلے ہیں۔"

پنڈت جی نے انہیں سمجھا کر کہا۔ "اندر آ گیا، تو کیا ہوا۔ تمہاری کوئی چیز تو نہیں چھوئی۔ زمین پاک ہے۔ ذرا سی آگ کیوں نہیں دے دیتیں؟ کام تو ہمارا ہی کر رہا ہے۔ کوئی لکڑہارا یہی لکڑی پھاڑتا، تو کم از کم چار آنے لیتا۔"

پنڈتانی نے گرج کر کہا۔ "وہ گھر میں آیا ہی کیوں؟"

پنڈت نے ہار کر کہا۔ "سسرے کی بدقسمتی تھی۔"

پنڈتانی۔ "اچھا اس وقت تو آگ دئے دیتی ہوں۔ لیکن پھر جو اس

گھر میں آ جائے گا، تو منہ جھلس دوں گی۔"

دکھی کے کانوں میں ان باتوں کی بھنک پڑ رہی تھی۔ بے چارا پچھتا رہا تھا، ناحق آیا، سچ تو کہتی ہیں۔ پنڈت کے گھر چمار کیسے چلا آئے۔ یہ لوگ پاک صاف ہوتے ہیں۔ تب ہی تو اتنا مان ہے۔ چمار تھوڑے ہی ہیں۔ اسی گاؤں میں بوڑھا ہو گیا، مگر مجھے اتی اکل (عقل) بھی نہ آئی۔ اسی لئے جب پنڈتانی جی آگ لے کر نکلیں، تو جیسے اسے جنت مل گئی۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر زمین پر سر جھکاتا ہوا بولا۔ "پنڈتانی ماتا! مجھ سے بڑی بھول ہوئی۔ کہ گھر سے چلا آیا۔ چمار کی اکل (عقل) ہی تو ٹھہری۔ اتنے مورکھ نہ ہوتے تو سب کی لات کیوں کھاتے؟"

پنڈتانی چمٹے سے پکڑ کر آگ لائی تھی۔ انہوں نے پانچ ہاتھ کے فاصلہ پر گھونگھٹ کی آڑ سے دکھی کی طرف آگ پھینکی۔ ایک بڑی سی چنگاری اس کے سر پر پڑ گئی۔ جلدی سے پیچھے ہٹ کر جھاڑنے لگا۔ اس کے دل نے کہا۔ یہ ایک پاک برہمن کے گھر کو ناپاک کرنے کا نتیجہ ہے۔ بھگوان نے کتنی جلدی سزا دے دی۔ اسی لئے تو دنیا پنڈتوں سے ڈرتی ہے۔ اور سب کے روپے مارے جاتے ہیں۔ برہمن کے روپے بھلا کوئی مار تو لے۔ گھر بھر کا ستیاناس ہو جائے۔ ہاتھ پاؤں گل گل کر گرنے لگیں۔

باہر آ کر اس نے چلم پی، اور کلہاڑی لے کر مستعد ہو گیا۔ کھٹ کھٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ سر پہ آگ پڑ گئی، تو پنڈتانی کو کچھ رحم آ گیا۔ پنڈت جی کھانا کھا کر اُٹھے، تو بولیں۔ "اس چمرا کو بھی کچھ کھانے کو دے دو۔ بے چارہ کب سے کام کر رہا ہے۔ بھوکا ہوگا۔"

پنڈت جی نے اس تجویز کو فنا کر دینے کے ارادے سے پوچھا۔

اس کے بعد ہی پنڈت جی پہنچے۔ پر چمر دے نیں کوئی آدمی لاش اُٹھا لانے کو تیار نہ ہوا۔ ہاں دکھی کی بیوی اور لڑکی دونوں ہائے ہائے کرتی وہاں سے چلیں۔ اور پنڈت جی کے دروازے پر آکر سر پیٹ پیٹ کر رونے لگیں۔ ان کے ساتھ دس پانچ اور چمارنیں تھیں۔ کوئی روتی تھی، کوئی سمجھاتی تھی۔ پر چمار ایک بھی نہ تھا۔ پنڈت جی نے ان سب کو بہت دھمکایا، سمجھایا، منت کی، پر چماروں کے دل پر پولیس کا ایسا رعب چھایا، کہ ایک بھی من نہ سکا۔ آخر ناامید ہو کر لوٹ آئے۔

۴

آدھی رات تک رونا پیٹنا جاری رہا۔ دیوتاؤں کا سونا مشکل ہو گیا۔ مگر لاش اٹھانے کوئی چمار نہ آیا۔ اور برہمن چمار کی لاش کیسے اُٹھائے؟ بھلا ایسا کسی شاستر پران میں لکھا ہے۔ کہیں کوئی دکھا دے۔

پنڈتانی نے جھنجھلا کر کہا۔ "ان ڈائنوں نے تو کھوپڑی چاٹ ڈالی سبھوں کا گلا بھی نہیں تھکتا۔"

پنڈت نے کہا۔ "چڑیلوں کو رونے دو۔ کب تک روئیں گی۔ جیتا تھا تو کوئی بات نہ پوچھتا تھا۔ مر گیا تو شور و غل مچانے کے لئے سب کی سب آ پہنچیں۔"

پنڈتانی۔ "چماروں کا رونا منحوس ہے۔"

پنڈت۔ "ہاں بہت منحوس۔"

پنڈتانی۔ "ابھی سے بو آنے لگی۔"

پنڈت۔ "چمار تھا سسرا کہیں کا۔ ان سبھوں کو کھانے پینے میں کوئی بچار نہیں ہوتا۔"

پنڈتانی۔ "ان لوگوں کو نفرت بھی نہیں معلوم ہوتی۔"

پنڈت: سب کے سب بھرشٹ ہیں "

رات تو کسی طرح کٹی۔ مگر صبح بھی کوئی چمار نہ آیا۔ چمارنی بھی رو پیٹ کر چلی گئی۔ بدبو پھیلنے لگی!

پنڈت جی نے ایک رسی نکالی۔ اس کا پھندا بنا کر مُردے کے پیر میں ڈالا۔ اور پھندے کو کھینچ کر کس دیا۔ ابھی کچھ کچھ اندھیرا تھا۔ پنڈت جی نے رسی پکڑ کر لاش کو گھسیٹنا شروع کیا۔ اور گھسیٹ کر گاؤں کے باہر لے گئے۔

وہاں سے آکر فوراً نہائے۔ درگا پاٹھ پڑھا اور سر میں گنگا جل چھڑکا۔

ادھر دکھی کی لاش کو کھیت میں گیدڑ، گدھ، اور کوّے نوچ رہے تھے یہی اس کی تمام زندگی کی بھگتی، خدمت اور اعتقاد کا انعام تھا۔!
